جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند کا علمی، دینی، ادبی ترجمان

ماہنامہ

محدثِ عصر

بانی

فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری رحمہ اللہ

مدیر

سید احمد خضر شاہ مسعودی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیادگار: محدثِ عصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند کا علمی، دینی، ادبی ترجمان

ماہنامہ

محدثِ عصر

مارچ/اپریل/مئی ۲۰۱۹ء جلد نمبر ۲، شمارہ نمبر ۵، ۴، ۳، سلسلہ ۱۸۸

بانی: فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری رحمہ اللہ

مدیر: سید احمد خضر شاہ مسعودی

نائب مدیر
مولانا فضیل احمد ناصری
08881347125

نگراں ترسیل
مولانا ابوطلحہ اعظمی
09997504588

اشتراک وتعاون

اندرون ملک:
فی شمارہ-/15 سالانہ-/150
خصوصی-/1000
تاحیات-/10000

بیرون ملک:
سالانہ:20امریکی ڈالر
خصوصی:100امریکی ڈالر
تاحیات:500امریکی ڈالر

شائع کردہ

جامعۃ الامام محمد انور شاہ دیوبند

عقب عیدگاہ، دیوبند 247554 (یوپی)

فون آفس: 01336-220471 فون وفیکس (مدیر) 01336-222471-223371

موبائل (مدیر): 08006075484

ای۔میل: ahmadanzarshah@gmail.com

Composed by: Umar Ilahi, Deoband # 9358013409

صریر خامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عصریات

❖**سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری**

وطن عزیز میں ان دنوں ۱۷ ویں عام انتخابات کی گہما گہمی ہے، جس وقت یہ سطور تحریر کی جارہی ہیں بیس ریاستوں کی ۹۱؍نشستوں پر رائے دہی ہوچکی ہے۔ لوک سبھا کے یہ انتخابات سات مراحل میں ہوں گے اور ۱۱؍اپریل سے ۱۹؍مئی تک جاری رہیں گے۔

یہ انتخابات ملکی تاریخ میں نہایت اہم تصور کئے جارہے ہیں، یہی سبب ہے کہ حزبِ اختلاف کو شکست دینے اور اس کا راستہ روکنے کے لئے ہر ممکن کوششیں جاری ہیں، انہیں کوششوں کا ایک اہم عنصر متعدد ریاستوں میں سیکولر جماعتوں کا اتحاد بھی ہے۔ اس اتحاد کے نتائج خوش گوار ہوتے ہیں یا پھر بھاجپا ہی کامرانی کے جھنڈے گاڑے گی، یہ وقت ہی بتائے گا، تاہم سیکولر پارٹیوں کے اس طرزِ عمل نے اپنے سیاسی حریف کے خیمے میں کھلبلی مچادی ہے۔ کاش کہ کانگریس بھی اس اتحاد کا حصہ ہوتی تو یوپی کے انتخابات سہ رخی نہ ہوکر دورخی رہ جاتے اور کمل کھلنے کے امکانات کم سے کم ہوجاتے۔

بہار کا عظیم اتحاد کیا گل کھلاتا ہے، اس کا ہر ایک کو شدت سے انتظار ہے، یہاں کانگریس، آر، جے ڈی، آر ایل ایس پی، ایچ اے ایم اور وی آئی پی جیسی سیاسی جماعتیں ایک پلیٹ فارم پر ہیں اور صوبے کی ۴۵؍سیٹوں پر خوش اسلوبی سے متفق بھی۔ یوپی کے بعد بہار ہی وہ صوبہ ہے جہاں کے نتائج ملکی سیاست میں موثر رول ادا کرتے ہیں۔ بہار میں اس بار چند نئے چہرے بھی میدان میں ہیں جن سے سیکولر ذہنیت رکھنے والوں کی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ بیگوسرائے اور کشن گنج کی نشستوں پر رائے دہندگان کی نظریں زیادہ ہیں، بیگوسرائے میں بھاجپا کے شعلہ بیان لیڈر گری راج کے بالمقابل نوجوان اور باشعور لیڈر کنہیا کمار ہیں جو سی پی آئی ایم کے ٹکٹ پر مستعدی سے کھڑے ہیں، اسی حلقے سے آر جے ڈی سے جناب تنویر

صاحب بھی امیدوار ہیں، جب کہ کشن گنج میں سابق ایم پی حضرت مولانا اسرارالحق قاسمیؒ کے بعد یہ پہلا الیکشن ہے، یہ وہ واحد نشست ہے جہاں تین تین مسلم امیدوار ایک ساتھ اکھاڑے میں ہیں، ان میں سے ایک کا تعلق جنتادل یو سے ہے، دوسرے کا تعلق عظیم اتحاد سے اور تیسرے کا آل انڈیا مسلم مجلس اتحاد المسلمین سے۔

دہلی میں کانگریس اور عام آدمی پارٹی کا اتحاد ہوجاتا تو حریف بھاجپا کے لئے کامیابی کی راہ میں سدّ سکندری حائل ہوسکتا تھا، لیکن لیت ولعل اور کشمکش کے درمیان بالآخر وہی ہوا، جو نہ ہونا چاہئے تھا۔ ۲۰۱۴ء کے عام انتخابات میں یہاں کی کل ساتوں نشستوں میں زعفرانی جماعت نے اپنا قبضہ جمایا تھا، حالات بتا رہے ہیں کہ اس بار بھی نتائج کچھ مختلف نہ رہیں گے، یہاں ووٹنگ ۱۲/مئی کو ہوگی۔

یہ الیکشن ایک طرف حکمراں جماعت کے لئے اقتدار کی برقراری کا ہے تو دوسری طرف دیگر پارٹیوں کے لئے آگے بڑھنے، ترقی کرنے اور مرکز تک پہنچنے کا۔ پچھلے پانچ سال بی جے پی کے لئے آزمائش بھرے رہے ہیں۔ گرانی، ہجومی تشدد، نوٹ بندی اور جی ایس ٹی جیسے مسائل نے عوام کے لئے پریشانیاں کھڑی کیں، وہیں رافیل، اندرونی انتشار اور زمینی ماحول بھی حکومت کے لئے دردِ سر بنے۔ اس الیکشن کے نتائج واضح کردیں گے کہ ملک سیکولرزم کے ساتھ چلے گا یا آر ایس ایس کے نظریے کا پابند ہوکر۔

❀ .... ❀ .... ❀

الیکشن کے دوران اربابِ سیاست جن موضوعات پر بولتے رہے، ان میں پلوامہ کا حساس ترین مسئلہ بھی ہے۔ ۱۴/فروری ۲۰۱۹ء کو کشمیر کے پلوامہ میں فوجی بسوں پر ایک اندوہناک حملہ ہوا، جس میں کم وبیش ۵۰/فوجی جاں بحق ہوگئے، اس سنگین صورت حال نے ہندوپاک میں کشیدگی کی صورتِ حال پیدا کردی اور یہ کشمکش ہنوز برقرار ہے۔ حملے کے بعد اس میں کوئی شک نہیں کہ پلوامہ حملہ ملک کی دفاعی سلامتی پر شدید ترین حملہ تھا، اس سے ہر ہندوستانی مغموم اور غصے میں تھا، ملک کا ہر شہری آج بھی اس کے ذمے دار لوگوں کو کیفرکردار تک پہنچانے کا خواہاں ہے۔ ایسے نازک موڑ پر ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جاں بحق ہونے والے فوجیوں کے پسماندگان کی اشک شوئی کی جاتی اور ملکی سلامتی کے لئے سیاسی پارٹیاں سر جوڑ کر بیٹھتیں، مگر ایسا نہ ہوا بلکہ ہوا تو یہ کہ الزام تراشیوں کا ایک تاریک سلسلہ شروع ہوا اور یہ اب بھی جاری ہے۔

❀ .... ❀ .... ❀

۱۵/ مارچ کا دن یوم شہداء کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ نیوزی لینڈ کے کرائسٹ چرچ میں ایک عیسائی دہشت گرد نے ہتھیاروں سے لیس ہو کر دو مسجدوں پر حملہ کر دیا، جس کے نتیجے میں ۶۰/ کے قریب نمازی شہید ہو گئے۔ جمعہ کا وقت تھا، نمازی مسجد میں تھے، خطبہ شروع ہونے میں چند منٹ ہی باقی تھے کہ فوجی لباس میں ملبوس ایک دہشت گرد کار سے آیا اور تیز قدم بڑھاتے ہوئے مسجد النور کے نمازیوں پر گولیوں کی بوچھار کر دی، گولیاں اس طرح برسائی جا رہی تھیں گویا چڑیوں کا شکار کیا جا رہا ہو، چند ہی منٹوں میں مسجد میں لاشوں کے انبار تھے، صحن خون آلود ہو چکا تھا، لین ووڈ کی مسجد کا بھی کچھ یہی عالم تھا، شہیدوں کی تعداد مزید بڑھ سکتی تھی، مگر نعیم راشد کے دفاعی اقدامات اور جرأت مندی نے مزید تباہیوں سے بچا لیا۔ اگر چہ نعیم بھی اپنی جان نہ بچا سکے مگر شہادتوں کی تعداد پر قدغن ضرور لگ گئی۔

حملہ آور اپنے مشن میں اس درجہ مست تھا کہ اپنی ساری کارروائیوں کی ویڈیو خود بناتا رہا اور براہِ راست اپنے فیس بک اکاؤنٹ سے نشر کرتا رہا، اس کا یہ خونی کھیل ۱۷/ منٹ تک جاری رہا۔ اس کی تینوں کلاشنکوف پر مسلمانوں کے تئیں نفرت انگریز جملے درج تھے، وہ گرفتار ہوا تو اسے اپنے فعل پر کوئی پشیمانی نہ تھی، بلکہ جب عدالت میں پابجولاں اسے پیش کیا گیا تو اس نے اپنی انگلیوں سے فتح کے نشان بھی بنائے۔ ایک ایسے وقت جب کہ مسلمان درد و کرب میں مبتلا تھے اور سخت بے چینی محسوس کر رہے تھے، عالمی برادری کی طرف سے دہشت گرد کے خلاف ویسا ردِ عمل نہ آیا جیسا کہ امید تھی، وہی برادری، جو کسی غیر مسلم کی موت پر واویلا مچا دیتی ہے اور پھر مسلم ممالک کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتی ہے۔ دہشت گرد امریکی صدر کا مداح تھا اور ان کا نام لے رہا تھا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کا علم بردار امریکہ بھی اس موقع پر خاموش رہا۔ آسٹریلیا میں تو صورتِ حال مزید المناک رہی، آسٹریلوی سینیٹر فریزیئر اینگ نے تو دہشت گرد کی حمایت کرتے ہوئے مسلمانوں کو ہی موردِ الزام ٹھہرایا اور ہذیان گوئی کی انتہاء کر دی، ان کا طرزِ عمل کوئی غیر ملک تو کیا، خود انہیں کے ملک میں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ ایک دن جب کہ سینیٹر پریس کانفرنس میں مگن تھے کہ وِل کون لی نامی ایک ۱۷/ سالہ نوجوان نے ان کے سر براہ پر انڈا توڑ کر احتجاج کیا اور ویڈیو بھی بنائی، جس کی ایک بڑے طبقے نے خوب پذیرائی کی۔ اگر چہ اس نوجوان کو دبوچ لیا گیا تاہم وہ یہ سبق دینے میں ضرور کامیاب رہا کہ دہشت گردی اور شدت پسندی انسان دشمنوں میں قبول ہو تو ہو، کوئی سنجیدہ اور انسانیت نواز کبھی اس کی حمایت نہیں کر سکتا۔

ان تمام احوال میں اقوام عالم کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ نیوزی لینڈ کی وزیر اعظم جاسنڈا آرڈرن کے دل خوش اقدامات ہیں، اس خاتونِ آہن نے اس پورے مسئلے کو جس خوبصورتی سے نمٹایا وہ بلا شبہ قابلِ تعریف اور لائقِ تقلید ہے۔ برقعہ پہن کر اور اسلامی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے اس نے شہداء کے اہل خانہ سے ملاقاتیں کیں اور ان کے آنسو پونچھے، پھر جب ۱۸/ مارچ کو ایوان کا اجلاس ہوا تو اس کا آغاز قرآن کریم کی تلاوت سے کرایا اور جب اس کے خطاب کا وقت آیا تو السلام علیکم سے تقریر شرع کی اور حدیث رسول پیش کر کے اسلامی تعلیمات کی خوبیوں کو آشکارا کیا۔ اس نے اپنے تعزیتی خطاب میں کہا کہ دہشت گرد کی خواہش تھی کہ دنیا میں اس کی شہرت ہو، مگر میں اس کا کبھی نام نہیں لوں گی۔ وہ بے نام تھا اور بے نام ہی رہے گا اور جب اگلا جمعہ آیا تو نیوزی لینڈ کی مساجد کی اذانیں باقاعدہ سرکاری ٹیلی ویژن سے نشر کرائی گئیں اور نیوزی لینڈ کی سرزمین اللہ اکبر کی صداؤں سے گونج اٹھی، مزید برآں یہ کہ نماز جمعہ کے وقت مسجد النور میں اپنے کارواں کے ساتھ بذاتِ خود شریک رہیں۔ جاسنڈا کے اس سلوک نے مسلمانوں کے دل موہ لئے اور اس کے لئے دل سے دعائیں نکلیں۔ جاسنڈا کا یہ انداز ان تمام ممالک کے لئے سبق ہے جو ایک مجرم اور دوسرے مجرم کے درمیان فرق کرتے ہیں اور مسئلے کی ڈور کو سلجھانے کے بجائے مزید الجھا دیتے ہیں۔

❀ .... ❀ .... ❀

وقت کی بے برکتی دیکھئے، یہ تعلیمی سال بھی پلک جھپکتے گزر گیا، سالانہ امتحان بھی ہو گیا، شب براءت بھی گزر گئی، اب رمضان کی آمد آمد ہے، ہفتہ عشرہ کے بعد وہ بھی شروع ہو جائے گا، مسلمانوں کا بیشتر طبقہ گناہوں پر جیتا اور گناہوں پر مرتا ہے، سال بھر اور سال کے ہر لمحے معاصی میں غرقاب، حیات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں ان کی کمزوریاں اجاگر نہ ہوں۔ جھوٹ، غیبت، وعدہ خلافی، دھوکے بازی، سود خوری، شراب نوشی، قمار بازی، بداخلاقی یہ وہ امراض ہیں جو لگاتار ناسور بنتے جا رہے ہیں۔ دین سے تعلق بس برائے نام رہ گیا ہے۔ اب رمضان آ رہا ہے تو رحمت کی بارشیں ایک بار پھر موسلا دھار برسیں گی، صبح و شام اللہ کی عنایات کا نزول ہوگا، افضال و برکات کا ظہور ہوگا، روزے ہوں گے، نوافل ہوں گے، تلاوتیں ہوں گی اور اوراد و وظائف کی کثرت ہوگی، صدقہ خیرات کا موسم ہوگا، انابت الی اللہ اپنی بلندی پر ہوگی، ایسے پر بہار ایام اور ان کی پر رونق ساعتوں سے ہمیں خوب فائدہ اٹھانا چاہیے۔

رمضان کا مہینہ اس قدر عظیم ہے کہ اسے خالقِ ہستی کی طرف منسوب کر کے ''شہراللہ'' کہا گیا، اس ماہ میں مسلمانوں پر روزے فرض کئے گئے، یہ روزے اتنے اہم ہیں کہ اگر بلا عذر کسی نے جان بوجھ کر توڑ دیا تو صرف ایک روزے کے بدلے میں لگا تار ساٹھ روزے رکھنے پڑیں گے۔ شدید بیماری اور انتہائی عمر دراز افراد کے لئے اگرچہ گنجائش ہے کہ ہر روزہ کے بدلے میں فدیہ دیں، مگر انہیں سخت تاکید بھی ہے کہ کھانے پینے کا عمل علانیہ نہ کریں۔

اس ماہ کی عظمت اس سے بھی عیاں ہے کہ قرآن اسی ماہ میں نازل ہوا، جس طرح قرآن کتاب ہدایت ہے اسی طرح رمضان بھی سر چشمۂ رحمت و برکت، اسی لئے اس ماہ میں تلاوت قرآن کا خصوصی اہتمام رکھا گیا۔ جبریل کے ہمراہ قرآن کا پورا دور دو بار ہوا، تو اسی ماہ قدسی مآب میں۔ تراویح جیسی اہم عبادت بھی اسی ماہ میں رکھی گئی، تاکیدی اعتکاف بھی انہیں ایام میں رکھا گیا، ان سب پر مستزاد یہ کہ اخیر عشرے میں شبِ قدر بھی رکھی گئی، جو ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ رمضان کی یہی وہ خصوصیات ہیں کہ آپ ﷺ جب اس کا چاند دیکھ لیتے تو پورے ماہ اپنی ازواج مطہرات سے علیحدہ رہتے۔ اس کا پہلا عشرہ رحمت کا ہے، دوسرا عشرہ مغفرت کا اور تیسرا جہنم سے آزادی کا۔ یہ مہینہ بڑے مجاہدے چاہتا ہے اور مغفرت کی پوری گارنٹی دیتا ہے۔ ان مجاہدوں اور تیس دنوں کی اطاعت وعبادت کے بعد پھر باری تعالیٰ کی طرف سے انعام کا ایک دن بھی رکھا گیا، جی ہاں! انعام کا یہ دن ''عید کا دن'' ہے۔ یہ ان لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے رمضان کے حقوق کی پوری رعایت کی اور اپنے نفس کو رذائل سے پاک کر کے اخلاق سے آراستہ کرلیا۔

اس ماہ میں دعائیں بھی خوب قبول ہوتی ہیں، اپنے لئے دعائیں کیجئے، قوم وملت کے لئے ہاتھ اٹھایئے، عالم اسلام کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھئے، ان دعاؤں میں سے ایک دعا یہ بھی کیجئے کہ لوک سبھا کے نتائج امتِ مسلمہ کے لئے بہتر اور سودمند ثابت ہوں۔

❀ .... ❀ .... ❀

ذٰلِكَ الْكِتاب

فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب کشمیری نور اللہ مرقدہٗ

والرّحمن ابلغ من الرّحيم لان زيادة البناء تدل علٰى زيادة المعنٰى كما فى قطع و قطّع و كبار و كبار و ذالك انما توخذ تارة باعتبار الكمية و اخرى باعتبار الكيفية فعلى الاول قيل يارحمٰن الدنيا لانه يعم المؤمن والكافر و رحيم الآخرة لانه يخص المؤمن و على الثانى قيل يارحمان الدنيا والآخرة و رحيم الدنيا لان النعم الاخروية كلها جسام و اما النعم الدنيوية فجليلة و حقيرة.

ترجمہ: رحمان رحیم سے زیادہ مبالغہ رکھتا ہے اور یہ اس لئے کہ جب الفاظ زائد ہوتے ہیں تو معانی میں بھی زیادتی ہوتی ہے۔ قَطَعَ بالتخفیف اور قَطَّعَ بالتشدید کُبار بالتخفیف اور کُبَّار بالتشدید کی مثالیں اسی حقیقت کو واضح کرتی ہیں اور معانی کی یہ زیادتی کبھی مقدار کے اعتبار سے ہوتی ہے اور گاہے کیفیت کے اعتبار سے اگر ہم مقدار کی زیادتی کا اعتبار کریں تو یا رحمان الدنیا کہنا مناسب ہے، چوں کہ دنیا میں رحمت عام ہے مومن و کافر سب اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور رحیم الآخرۃ کہا جائے گا چوں کہ وہاں رحمت صرف مومن ہی کے لئے ہوگی۔ کافر شریک نہ ہوگا اور اگر کیفیت کا خیال کریں تو یا رحمان الدنیا والآخرۃ کہیں گے کہ جس میں رحمان کا تعلق ہر دو عالم سے کر دیا گیا ہے اور رحیم الآخرۃ کہ صرف تعلق آخرت سے ہے اور یہ اس لئے کہ آخرت کی نعمتیں سب بڑی اور قابل قدر ہیں اور نعمت ہائے دنیا کا حال یہ ہے کہ اس میں بڑی بھی ہیں اور چھوٹی بھی۔

تشریح : گذری ہوئی تفصیلات سے واضح ہوا تھا کہ رحمان ورحیم دونوں ہی مبالغے کے صیغے ہیں، لیکن جب اس نقطۂ نظر سے ہٹ کر دونوں کے باہمی فرق پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ رحمان میں رحیم کے مقابلہ میں زیادہ مبالغہ ہے، رحمان میں الفاظ زائد ہیں رحیم میں اس کے

مقابلہ میں کم اور جب الفاظ زائد ہوتے ہیں تو زائد معنی پران کی ولادت بھی ہوتی ہے معنی یہاں مبالغہ کے ہیں تو رحمان مبالغہ پر زیادہ دلالت کرے گا (الفاظ زائد ہونے کی بناپر) رحیم کم پر (الفاظ کم ہونے کی بناپر) یہی وجہ ہے کہ قَطَعَ بالتخفیف کے معنی ''کاٹنا'' ہیں۔اور قَطَّعَ بالتشدید میں۔بار بار کاٹنے کا مفہوم داخل ہے۔ کُبّار بالتخفیف کے معنی ''بڑا'' ہیں لیکن کبّار کا ترجمہ بہت بڑا ہوگا۔ہوسکتا ہے کہ اس تقریر پر کسی کو یہ اشکال ہو کہ حَذِرَ میں تین لفظ ہیں اور حَاذِر میں چار مگر حَذِرْ باوجود کمی الفاظ کے زائد معنی پر دلالت کرتا ہے اور حَاذر میں الفاظ زائد ہیں تاہم معنی کم۔ حَاذِر کے معنی ہیں بچنے والا جب کہ حَذِرْ کا ترجمہ ہے بہت زیادہ بچنے والا یا ہمیشہ بچنے والا تو آپ نے جو یہ اصول بیان کیا تھا کہ الفاظ کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے حذر اور حاذر میں باقی نہ رہا۔اس کا جواب یہ ہے کہ اس قاعدہ میں ایک شرط بھی ملحوظ رہے کہ دونوں صیغے ایک ہی اصل سے ہوں اور ایک ہی نوع کے ہوں اور یہاں نوعیت بدل گئی، چوں کہ حذر صفت مشبہ اور حاذر اسم فاعل ہے مگر یہ جواب جمہور کے نقطۂ نظر کے مطابق ہے۔سیبویہ کا نقطۂ نظر اس جواب سے درست نہیں ہوتا اور وہ اس لئے کہ وہ رحم کو اسم فاعل اور رحمان کو صفت مشبہ مانتے ہیں تو زیادہ صحیح اور جامع جواب یہ ہوگا کہ زیادتی لفظ الخ کوئی دستورِ عام نہیں ہے بلکہ بیشتر ایسا ہوتا ہے یہ اور یہاں ایسا ہی ہوا۔

رحمان ورحیم کے درمیان فرق مزید واضح کرنے کے لئے قاضی صاحب کہتے ہیں کہ وہ زائد معانی جو رحمان سے سمجھ میں آتے ہیں وہ کبھی تو مقدار ہوتی ہے اور کبھی کیفیت میں مقدار میں زیادتی کا مطلب افراد کی کثرت ہے اور کیفیت میں زیادتی کا مطلب جزوی قوت وطاقت ہے تو اگر ہم رحمان میں مقدار کا اعتبار کریں تو رحمان الدنیا کہنا چاہئے چوں کہ یہاں مومن اور کافر دونوں رحمتِ خداوندی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں بلکہ پوری کائنات فائدہ اٹھا رہی ہے اور رحیم الآخرۃ کہنا مناسب ہوگا وہاں خداتعالیٰ کی رحمتیں سمٹ جائیں گی اور صرف مومن ہی استفادہ کرے گا۔ یہ اس لئے کہ آخرت وقتِ جاز ہے، وہاں احسن الجزاء نیکوکاروں ہی کے حصہ میں آئے گی اور کافر نے شناعت اعمال کے سوا اور کوئی کام کیا نہیں، اس لئے اس کو استحقاقِ رحمت کہاں سے حاصل ہو۔

اس زیادتی بحسب المقدار کا خیال کرتے ہوئے بعض علماء نے یا رحمان الدنیا والآخرۃ و رحیم الآخرۃ کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اے وہ ہستی! جس کی رحمت کے آثار بکثرت پائے جاتے ہیں۔بعض علماء مقدار میں زیادتی کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر مقدار کی زیاتی کو ثابت کرنے کے لئے رحمان الدنیا کہا جائے اور رحیم کا تعلق آخرت سے قائم کریں تو کیفیت کے اعتبار سے رحیم میں زیادتی

ہوجائے گی تو گویا دونوں زیادتی پر دلالت کر رہے ہیں۔ رحمان بھی اور رحیم بھی۔ ایک مقدار کے اعتبار سے اور ایک کیفیت کے لحاظ سے، جس کا حاصل یہ نکلا کہ دونوں میں کوئی فرق نہ نکلا۔ حالاں کہ ایسا نہیں، بلکہ فرق ہے، یہی وجہ ہے کہ زمخشریؒ نے رحمان اور رحیم کے درمیان خاص اس حیثیت سے فرق نہیں کیا، اس کا جواب یہ ہے کہ جب ہم مقدار میں زیادتی کا خیال کریں تو دونوں لفظ مقدار کے لئے استعمال کئے جائیں گے۔ کیفیت پیش نظر نہ رہے گی، فرق پھر ہوجائے گا، چوں کہ کمیت کے اعتبار سے رحمان زیادہ ابلغ ہے بمقابلہ رحیم کے، نیز اگر زیادتی باعتبار کیفیت کے پیش نظر رہے تو رحمان کا تعلق دونوں عالم سے ہوسکتا ہے یعنی رحمان الدنیا و الآخرۃ کہہ سکتے ہیں۔ رحیم کی نسبت آخرت کی طرف نہیں ہوسکتی چوں کہ آخرت کی تمام نعمتیں جلیل الشان ہیں یعنی رحمان الدنیا و الآخرۃ کہہ سکتے ہیں۔ رحیم کی نسبت آخرت کی طرف نہیں ہوسکتی چوں کہ آخرت کی تمام نعمتیں جلیل الشان ہیں، دنیا کی نعمتوں کا حال دوسرا ہے۔ یہاں اعلیٰ بھی ہیں اور ادنیٰ بھی تو چھوٹی نعمتوں کا خیال کرتے ہوئے رحیم کی اضافت دنیا کی طرف کی جاسکتی ہے۔ اب رحیم الدنیا کا ترجمہ ہوگا۔ دنیا میں چھوٹی چھوٹی نعمتوں کے انعام کرنے والے۔

و انما قدم و القياس يقتضى الترقى من الادنىٰ الى الاعلىٰ لتقدم رحمة الدنيا و لانه صار كالعلم من حيث انه لا يوصف به غيره لانه معناه المنعم الحقيقى البالغ فى الرحمة غايتها و ذالك لا يصدق على غيره لان من عداه فهو مستفيض بلطفه و انعامه يريد به جزيل ثواب او جميل ثناء او مزيح رقة الجنسية اوحب المال عن القلب ثم انه كالواسطة فى ذالك لان ذات النعم و وجودها ولاقدرة على ايصالها و الداعية الباعثة عليه و التمكن من الانتفاع بها و القوى اللتى بها يحصل الانتفاع الى غير ذالك من خلقة لا يقدر عليها احد غيره او لان الرحمان لما دل علىٰ جلائل النعم و اصولها ذكر الرحيم ليتناول ماخرج منها فيكون التتمة ولارديف له اوله حافظة على رؤس الآى.

ترجمہ: اور رحمان کو رحیم پر مقدم ذکر کیا گیا حالاں کہ رحیم سے رحمان کی جانب آنا چاہئے تھا چوں کہ عقلاً ترتیب یہی مناسب ہے کہ ادنیٰ کے بعد اعلیٰ ذکر کیا جاتا ہے، ایسا اس لئے کیا گیا کہ دنیاوی رحمتیں اخروی نعمتوں سے پہلے ہیں نیز اس بناء پر بھی کہ رحمان علَم کی حیثیت اختیار کرگیا کہ وہ خود موصوف بنتا ہے کسی کی صفت نہیں بنتا چوں کہ رحمان کے معنی ایک ایسا منعم جو رحمت کے انتہائی درجہ پر پہنچا ہوا ہو اور یہ ترجمہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے خدا تعالیٰ کے سوا اور کسی پر صادق نہیں آتا، خدا کے علاوہ دوسرے اگر کچھ

کام کرتے ہیں تو اس کی جزا کے طالب رہتے ہیں۔ بیشتر دنیا ہی میں چاہتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو آخرت میں طالب ہیں۔ بہرحال بدلہ کے سب طالب ہیں اور اگر بدلے و جزا کے طالب نہیں تو یہی خواہش ہوتی ہے کہ ہمارا ممنون کرم ہمارے حسنِ سلوک کی تعریف کرے اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنے ہم جنس کے حالِ زار کو دیکھ کر قلب میں سوز و گداز پیدا ہوا تو حسنِ سلوک کے ذریعہ اس قلبی اذیت کو دور کرنا مقصود ہے یا کبھی داد و دہش انسان کی انسان پر حبِ مال کو دور کرنے کے لئے ہوتی ہے (غرضیکہ ہرصورت میں انسان کا دینا کسی نہ کسی مقصد کے لئے ہوتا ہے جب کہ خدا تعالیٰ کی عنایات اور افضال کسی ذاتی مقصد کے لئے نہیں ہوتے) نیز یہ بھی ہے کہ انسان جو دوسرے انسان کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہے وہ واسطہ کی حیثیت رکھتا ہے ورنہ تو تمام انعامات منجانب اللہ ہیں۔ اگر یہ نعمتیں نہ ہوتیں تو یہ کہاں سے دیتا، دینے کی قدرت بھی انہیں کی دی ہوئی ہے، سخاوت کا جذبہ بھی وہی پیدا کرتے ہیں، نعمتوں سے نفع اٹھانے کی صلاحیت بھی ان ہی کی جانب سے ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ سب خدا تعالیٰ کی جانب سے ہے، کسی اور جانب سے نہیں (اس لئے رحمان کو رحیم پر مقدم کیا) اور یہ بھی یاد رکھئے کہ لفظ رحمان جلیل نعمتوں پر حاوی و شامل ہے اور چھوٹی نعمتوں کو سمیٹنے کے لئے رحیم کو فہرست نعمت کو مکمل کرنے کے لئے ذکر کیا اور ہوسکتا ہے کہ آیات کا جو ایک انداز چلا آرہا ہے اسے بدستور باقی رکھنے کے لئے رحیم کو آخر میں ذکر کیا ہو۔

تشریح : یہ اصل میں ایک الجھن کو دور کرنے کے لئے طویل عبارت قاضی صاحبؒ کے قلم سے نکلی ہے۔ **من الادنیٰ الی الاعلی** ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ایک تکرار ہوتا ہے اور ایک تاسیس، تکرار میں پہلی بات بعینہ لوٹا دی جاتی ہے۔ مخاطب کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ جب کہ تاسیس میں مخاطب کے لئے نئے فوائد مہیا ہوتے ہیں۔ اب جب کہ رحمان میں چھوٹی بڑی تمام ہی نعمتیں آگئیں تو رحیم سے کوئی نیا فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ عام انسانوں کی بھی گفتگو میں یہ جھول نہ ہونا چاہئے، چہ جائے کہ حضرت حق جل مجدہٗ کا کلام بلاغت التیام، کہ اسے تو ہر نقص سے پاک و منزہ ہونا چاہئے۔

جب یہ تمہید ذہن نشین ہوگئی تو ایک تفصیل گوش گذار ہے وہ یہ کہ:

الرّحمان و الرّحیم ظاہر ہے کہ اوصافِ خدا ہیں اور **الرّحمان** وسیع ترین مفہوم پر حاوی ہے۔ **رحیم** میں یہ بات نہیں، قیاساً **رحیم** کو مقدم ہونا چاہئے تھا اور **رحمان** کو مؤخر، اسی کے حل کے لئے قاضی صاحبؒ نے چند جوابات پیش فرمائے ہیں:

۱- چوں کہ **رحمان** مقدارِ رحمت کی عظمت و وسعت پر دلالت کرتا ہے، یعنی **رحمان** اسے اس

وصف پر مقدم کر دینا ہی چاہئے تھا جس کا ظہور عالم آخرت میں ہوگا یعنی رحیم۔

۲- لفظ رحمان لفظ اللہ سے اشبہ ہے جیسے لفظ اللہ خدا ہی کے لئے استعمال ہوتا تھا، اسی طرح علَمِ ذاتی ہونے کی بنا پر یہی شان لفظ رحمان میں پیدا ہوگئی کہ رحمان کا اطلاق بھی غیر خدا پر نہیں ہوتا۔ وہ موصوف بنتا ہے کسی کی صفت نہیں بنتا اور یہ آپ جانتے ہیں کہ موصوف اوصاف سے مقدم ہوتا ہے۔ جب رحمان میں موصوف کی شان ہے تو اسے باقی اوصاف پر مقدم ہونا چاہئے۔ بخلاف رحیم کے کہ یہ غیر خدا کے لئے بھی استعمال ہو جاتا ہے۔ خود قرآن کریم میں آں حضور ﷺ کے لئے استعمال کیا گیا **بِالنّاس لرؤف رحیم** تو معلوم ہوا کہ **رحیـــم** میں علمیت کی بو نہیں ہے بلکہ وصف کا رنگ نمایاں ہے اور اوصاف موصوف کے بعد آتے ہیں، لہٰذا رحیم کو مؤخر ہونا چاہئے تھا۔

توجہ کیجئے! **رحـــمـــان** کا مطلب ہے وہ ہستی جو رحمت کے ایسے انتہائی درجہ پر پہنچی ہوئی ہو جس کے بعد رحمت کا کوئی اور درجہ متصور نہ ہو اور یہ حقیقت صرف ذاتِ خدا پر صادق آتی ہے، غیر خدا کوئی بھی ہو اس میں رحمت اتنی بھرپور نہیں پائی جا سکتی۔ یہیں سے یہ نکتہ ہاتھ لگا کہ رحمان کہلانے کا مستحق صرف خدا ہے اور کوئی نہیں۔

ایک بات یہ بھی یاد رکھئے کہ حقیقی منعم وہی ہے جو نعمتیں عطا کرتا ہو، نیز اس کے انعام واکرام میں خود اس کے لئے کوئی منفعت نہ ہو۔ ان دونوں باتوں کے لئے جب کوئی آپ مصداق تلاش کریں گے تو خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہ ملے گا، اسے یوں سمجھئے کہ میں آپ کو کچھ دے رہا ہوں یا آپ مجھ پر کوئی عنایت کر رہے ہیں جو دینا لینا ہمارے اور آپ کے مابین ہو رہا ہے یہ چیز آئی کہاں سے؟ ظاہر ہے کہ اس کا وجود خدا ہی کی جانب سے ہے، انسان طبعاً حریص ہے۔ **قَال اللّٰہ تَعَالیٰ وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّح** وہ کسی کو دینے کے لئے اولاً تیار نہیں ہو سکتا۔ اگر دیتا ہے تو یہ جذبۂ داد و دہش خدا تعالیٰ کا ہی پیدا کردہ ہے۔ ہم سب مثل مفلوج کے ہیں کہ حرکت کر نہیں سکتے، تاوقتیکہ خدا تعالیٰ ہم میں قدرت پیدا نہ فرمائے، اب دینے کی جو قدرت ہے یہ بھی من جانب اللہ ہے، اس سے آپ سمجھے ہوں گے کہ سب کچھ خدا تعالیٰ کی جانب سے ہے بندے کا کچھ بھی نہیں، پھر اسے بھی ملحوظ رکھئے کہ ہم دے کر ممنونِ کرم سے کوئی نفع چاہتے ہیں یا اپنے سے کوئی نقصان دور کرنا چاہتے ہیں منفعت کی ایک صورت یہ ہے کہ محسن اپنے ممنون سے خدمت کی توقع رکھے یا کسی وقت نیک سلوک کی یا تعریف ہی کا منتظر ہو اور اگر نیکی میں بہت آگے بڑھ گیا تو اپنے دیئے لئے کا بدلہ آخرت میں چاہے گا۔ آخرت طلبی فی الجملہ بہتر چیز ہے لیکن گفتگو اس میں ہے کہ بندہ غرض سے بالا نہیں یا طالب عاجل ہے یا آجل جب کہ خدا تعالیٰ جو انعام فرماتے ہیں نہ عاجلاً اس کا بدلہ چاہتے ہیں نہ آجلاً۔ (جاری)

❀❀❀

ہندوستان میں

اسلام کی اشاعت کیوں کر ہوئی

علامہ سید سلیمان ندویؒ

خلفاء بنی امیہ سے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد کسی اور خلیفہ کے متعلق معلوم نہیں کہ اس نے ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کی کوشش کی ہو، یا تو خود بخود اسلام نے اپنا راستہ آپ صاف کیا یا طالبین حق نے خود آگے بڑھ کر دست گیری کی اور اسلام کی اشاعت ہوئی، یا علماء، مشائخ اور تجار نے اپنا فریضۂ تبلیغ ادا کیا، تاہم ملک سندھ میں اسلامی مرکز کے قیام نے اس کے اطراف میں اسلام کی روشنی پہنچانے میں بڑا کام کیا، منصور کے عہد میں سندھ کا شہر گندہار فتح ہوا اور وہاں بت خانہ کے بجائے مسجد تعمیر ہوئی تو حکم الٰہی سے وہ وہاں سرسبزی و شادابی ہوئی اور خوب غلہ پیدا ہوا، اس پر وہاں کے باشندوں نے مسجد بڑے خیر و برکت کی چیز سمجھا اور اس کو بڑا متبرک قرار دیا۔ (بلاذری، طبع یورپ، ص: ۴۴۵)

بنو عباس کے عہد فرماں روائی کے ساتھ اسلام میں عقلی معرکہ آرائیوں نے نئے برگ و بار پیدا کئے اور مخالفین اسلام کے اعتراضات کے جواب میں کتابیں تصنیف ہونے لگیں اور سلطنت نے ہر طرح اس کام میں مصنفین کی مدد کی۔

علم کلام کا پہلا بانی واصل بن عطا ہے۔ ۸۰ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوا اور ۱۸۱ھ میں وفات پائی، بصرہ جو ہندوستان کا بندرگاہ تھا، اس کا مسکن تھا، اسلام کی پہنائے سلطنت میں جو غیر مسلم فرقے تھے، ان میں ایک ہندوستان کا فرقہ سمنیہ بھی تھا، آپ پہلے بڑھ چکے ہیں کہ عرب سمنیہ، بودھ کے پیرو کو کہتے تھے، جو خدا کی مستقل ہستی کے قائل نہ تھے، جہم بن صفوان جو فرقہ جہمیہ کا بانی ہے، اس سے اس بدھ مت والوں کا مناظرہ ہوا، بودھوں نے کہا کہ اشیاء کے علم و معرفت کے تمہارے پاس صرف پانچ ذریعے ہیں، یعنی حواس

خمسہ، یہ بتاؤ کہ تم کو اپنے خدا کا علم ان میں سے کس حاسہ کے ذریعہ ہوا، جہم نے کہا: ان میں سے کسی سے نہیں، بودھیوں نے کہا تو پھر خدا مجہول ہے، یعنی اس کے وجود پر کیوں کر یقین ہو، جہم کوئی جواب نہ دے سکا، اس نے واصل کو یہ اعتراض لکھ کر بھیج دیا، واصل نے جواب میں لکھا کہ ''انسان کے پاس علم ومعرفت کے علاوہ ایک چھٹا ذریعہ بھی موجود ہے اور وہ دلیل ہے، ان سے پوچھو کہ دیوانہ اور ہشیار میں زندہ اور مردہ میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ ہاں کہنے سے چارہ نہیں اور یہ فرق صرف دلیل سے معلوم ہوتا ہے، جہم نے بھی یہی جواب جا کر بودھ والوں کو دیا، انہوں نے کہا یہ تمہارے دماغ کی بات نہیں، جہم نے اقرار کیا اور ان کو واصل کا پتہ دیا، حق کے طالب واصل کے پاس گئے اور اس سے گفتگو کی اور اسلام کی حقانیت پر اس کے دلائل سن کر مسلمان ہو گئے۔ (شرح کتاب الملل والنحل یحییٰ زبیدہ، ترجمہ واصل، تراجم معتزلہ کا یہ حصہ ڈاکٹر آرنلڈ نے ذکر المعتزلہ کے نام سے الگ رسالہ میں چھپوایا ہے، دیکھو رسالہ مذکور، ص: ۲۱، مطبوعہ دائرۃ المعارف، حیدر آباد دکن)

سندھ کے راجاؤں کو جیسے جیسے اسلام سے واقفیت ہوتی جاتی تھی، ان کا میلان اس کی طرف بڑھتا جاتا تھا، یہاں تک کہ ہم کو ہندوستان کے ایک ایسے راجہ کا بھی علم ہے جس کو آں حضرت ﷺ اور اہل بیت اطہار سے غایت درجہ عقیدت تھی، منصور عباسی کی خلافت میں جب سادات علویہ نے خروج کیا اور ان کو کچھ کچھ کامیابیاں ہونے لگیں تو محمد علوی کے فرزند عبداللہ اشتر نے اپنے باپ کے حکم سے سندھ کا رخ کیا، اس وقت سندھ میں عمر بن حفص ایک عرب والی تھے، اس نے عبداللہ بن الاشتر کا نہایت دھوم دھام سے استقبال کیا اور سندھ میں عباسیوں کے بجائے علویوں کی حکومت کا اعلان ہو جانے والا تھا، سپید علم بن چکے تھے کہ دفعۃً علویوں کو شکست ہوئی اور ساری تجویز خاک میں مل گئی، عبداللہ نے کہا کہ اے عمر! اب میری جان تمہارے ہاتھ میں ہے، عمر نے کہا گھبرایئے نہیں، یہاں سندھ کے راجاؤں میں سے ایک بڑا راجہ ہے، جس کے پاس بڑی قوت ہے اور اس کے ساتھ وہ اشد الناس تعظیماً لرسول اللہ ﷺ ہے، یعنی آنحضرت ﷺ کے ساتھ اس کو نہایت سخت عقیدت ہے، تم اس سے معاہدہ کر کے اس کے پاس چلے جاؤ، پھر تمہارا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکے گا، چنانچہ عبداللہ نے ایسا ہی کیا، اس نے ان کو بڑی عزت وتکریم سے لیا اور وہاں وہ شاہانہ تزک واحتشام سے رہنے لگے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ان کے چارسو طرف دار زیدی بھی ان کی خدمت میں چلے گئے، منصور کو یہ معلوم ہوا تو عمر کو سندھ کے مشرق سے ہٹا کر افریقہ کے مغرب میں والی بنا کر بھیج دیا اور اہل بیت کی خاطر راجہ نے منصور جیسے پر شکوہ بادشاہ کی خفگی برداشت کی، عبداللہ مع اپنے دس ہمراہیوں کے اتفاقاً نئے والی ہاتھ گرفتار ہو گئے۔ (کامل ابن اثیر، واقعات ۱۵۱ھ)

مکران کے سینکڑوں ہمراہی غالباً وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔

خلفائے عباسیہ کے آغاز عہد میں دو مقابل کے حریف گروہ تھے، ایک محدثین جو اپنے عمل اور نمونہ سے دین کی روح پھونکتے تھے اور دوسرے متکلمین جو اپنے زور بیان، قوت استدلال اور مخالفین کے معترضانہ خیالات کی تردید کر کے لوگوں کو قبول حق کی دعوت دیتے تھے، خلیفہ ہارون رشید پہلے گروہ کا حامی تھا مگر اتفاقاً بعض واقعات ایسے پیش آئے جنہوں نے ہارون کو بالآخر متکلمین کی طرف بھی ملتفت کر دیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سندھ اور ہندوستان کے بودھی راجاؤں میں اسلام کی طرف جو رجحان پیدا ہو رہا تھا، دربار کے بودھ پرست پنڈتوں کو اس کی روک تھام کی بڑی فکر رہا کرتی تھی، منجملہ راجاؤں کے ایک راجہ کا ذکر ہے کہ اس نے اپنا میلان اسلام کی طرف ظاہر کیا تھا اور اس کے دربار کے پنڈتوں نے اسے سمجھانا چاہا، یہ واقعہ دو طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے، ایک یہ کہ پنڈت نے راجہ کو سمجھایا کہ یہ مذہب دلیل و برہان کا نہیں ہے بلکہ صرف تلوار کی قوت سے پھیلتا ہے، چنانچہ راجہ نے ہارون رشید کو لکھا کہ ''تم ایک ایسے گروہ کے سردار ہو جو انصاف پسند نہیں، وہ صرف تقلیدی مذہب رکھتے ہیں اور تلوار سے غلبہ پاتے ہیں، اگر تم کو اپنے مذہب کی صداقت کا یقین ہے تو کسی کو میرے پاس بھیجو کہ میں اس سے مناظرہ کروں، اگر حق تمہاری طرف ہوا تو میں مسلمان ہو جاؤں گا اور اگر حق میری طرف ہوا تو تم کو میرا مذہب قبول کرنا ہوگا۔

ہارون نے یہ خط پا کر ایک محدث کو سندھ روانہ کیا، راجہ نے ان کی بڑی خاطر مدارات کی، مناظرہ شروع ہوا، پنڈت نے راجہ کی طرف سے محدث موصوف کے سامنے یہ سوال پیش کیا کہ بتاؤ تمہارا خدا قادر علی الاطلاق ہے یا نہیں؟ محدث نے جواب دیا بے شک ہے۔ پنڈت نے کہا تو کیا وہ اس پر بھی قادر ہے کہ وہ اپنے مثل آپ پیدا کرے، اگر نہیں کر سکتا ہے تو وہ قادر علی الاطلاق نہیں ہوا، محدث نے یہ لفظی گورکھ دھندے سن کر کہا یہ کلامی مباحث ہیں، جن میں پڑنا ہم بدعت سمجھتے ہیں۔ پنڈت نے راجہ کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ حضور نے دیکھ لیا کہ جو کچھ میں کہتا تھا سچ ثابت ہوا، راجہ نے پھر ہارون رشید کو لکھا کہ پہلے تو صرف لوگ یہ کہتے تھے کہ اسلام دلیل اور برہان کا مذہب نہیں اور مجھے ان کے کہنے کا یقین نہ تھا، اب تو بداہۃً معلوم ہو گیا کہ وہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں سچ کہتے ہیں اور مجھے یقین ہو گیا کہ تمہارا مذہب غلط ہے۔ ہارون کے پاس یہ خط پہنچا تو اس پر قیامت گذر گئی اور نہایت دل تنگ ہوا اور اہل دربار سے کہا کہ کیا اب اس دین کا کوئی ایسا سپاہی نہیں، جو اس کی طرف سے لڑ سکے۔ لوگوں نے عرض کیا کیوں نہیں؟ بہت ہیں، پوچھا وہ کون ہیں؟ جواب دیا وہی لوگ جن کو حضور والا نے دین میں بحث وجدال کرنے سے روک دیا ہے۔ خلیفہ ہارون رشید نے ان کو حاضر ہونے کا حکم دیا، وہ آئے تو اس نے راجہ کا اعتراض ان کے سامنے رکھا، ان میں سے ایک نو

عمر متکلم نے آگے بڑھ کر کہا کہ یہ سوال ہی غلط ہے، جو مخلوق ہوگا وہ حادث ہوگا اور جو حادث ہوگا وہ قدیم کے مثل نہیں ہوسکتا، اس لئے یہ سوال کہ خدا جو قدیم یعنی ازلی وابدی ہے، وہ اپنے مثل پیدا کرسکتا ہے یا نہیں، ایسا ہے جیسے کوئی یہ سوال کرے کہ خدا اپنے کو عاجز یا جاہل بنادینے پر قدرت رکھتا ہے یا نہیں؟ خلیفہ ہارون رشید اس نوعمر متکلم کا جواب سن کر بہت خوش ہوا اور حکم دیا کہ اسی کو راجہ کے دربار میں بھیجا جائے۔ درباریوں نے عرض کیا کہ ممکن ہے کہ وہاں اور بھی کچھ مشکل سوالات پیش ہوں، جن کا جواب یہ نوعمر متکلم نہ دے سکے، اس لئے کسی تجربہ کار کو بھیجنا چاہئے۔ چنانچہ معمر ایک مشہور متکلم کا انتخاب ہوا اور اس کو مناظرہ کے لئے ہندوستان بھیجا گیا۔ پنڈت معمر کی شہرت سن چکا تھا، اس نے خیال کیا کہ اگر معمر صحیح وسالم راجہ تک پہنچ گیا تو پھر خیر نہیں، اس لئے اس نے راستہ ہی میں زہر دے کر اس غریب کا کام تمام کرادیا۔

اس واقعہ کی دوسری صورت یہ ہے کہ ہندوستان کے بعض راجاؤں نے ہارون رشید کو لکھا کہ اپنے یہاں سے اسلام کا کوئی عالم یہاں بھیجئے، جو مجھے اس مذہب سے باخبر کرے اور ہمارے پنڈت سے مناظرہ کرے۔ ہارون نے ایک محدث کو بھیجا، پنڈت نے راستہ ہی میں کسی کو بھیج کر جانچ لیا کہ یہ کس قابلیت کا آدمی ہے۔ محدث صاحب جب دربار میں پہنچے تو راجہ نے سب پنڈتوں کو جمع کیا اور مناظرہ شروع ہوا۔ ایک پنڈت نے پوچھا کہ تمہارے مذہب کی صداقت کی کیا دلیل ہے؟ محدث نے ایک سلسلۂ سند سے آں حضرت ﷺ سے ایک حدث بیان کی کہ یہ مذہب سچا ہے۔ پنڈت نے کہا تو تم نے جس شخص سے یہ قول نقل کیا اس کو کیوں کر جانا کہ وہ اپنے دعوائے نبوت میں صادق تھا۔ محدث صاحب نے اس کے ثبوت میں قرآن پاک کی چند آیتیں تلاوت کیں۔ پنڈت نے کہا کہ تم نے کیوں کر جانا کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ محدث صاحب یہ طرز گفتگو و بحث سن کر خاموش ہوگئے۔ راجہ نے باعزاز تمام ان کو واپس کردیا اور ہارون کو لکھا کہ کسی متکلم کو بھیجئے جو اصل مذہب کی صداقت کی دلیلیں ہمارے سامنے پیش کرسکے۔ ہارون نے خلدہ نامی ایک متکلم کو بھیجا، ابھی وہ راستہ ہی میں تھا کہ پنڈت نے اس کے پاس بھی آدمی بھیج کر امتحان کرلیا کہ وہ کس قابلیت کا آدمی ہے اور ڈر کر راستہ ہی میں زہر دلوادیا اور وہ مرگیا۔ (ذکر المعتزلہ یحیٰی زبیدی، طبع حیدرآباد، ص: ۳۵)

اس واقعہ سے مجھے صرف یہ دکھانا تھا کہ اسلام ہندوستان میں آہستہ آہستہ اپنے اثرات پھیلا رہا تھا اور لوگوں میں یہ خیالات پیدا ہورہے تھے کہ آخر یہ مذہب کیا ہے؟ اور کہاں تک یہ سچا ہے؟ غرض اسلام بھی ہندوستان کا ایک قابل وقعت مذہب بن گیا اور اسی لئے جب کبھی ہندوؤں نے مسلمانوں کو سندھ کے کسی علاقہ سے بے دخل کیا تو اکثر مسجدوں کا احترام قائم رکھا اور وہاں کے مسلمانوں کے جمعہ و جماعت میں خلل نہیں ڈالا۔ مامون (متوفی ۲۱۸ھ) کے عہد میں ایک مسلمان افسر نے سندان واقع کچھ فتح کرلیا اور

تھوڑے ہی دنوں کے بعد ہندوؤں نے اس کو واپس لے لیا و وہاں کی مسجد کو علیٰ حالہ باقی رکھا اور اس سے کوئی تعرض نہیں کیا، وہاں جتنے مسلمان رہ گئے تھے وہ اس میں نماز ادا کرتے تھے اور خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتے تھے۔ (بلاذری، طبع یورپ، ص: ۴۴۶)

ہارون رشید اور مامون کے زمانہ میں سندھ کے جو حکماء اور اطباء بغداد گئے تھے ان میں بہت سے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے، البتہ ایک شخص صالح بن بہلہ ہندی نے اسلام ضرور قبول کرلیا تھا، آج کل کے محققوں نے صالح کے عربی نام کو الٹ پھیر کر ہندی نام کے قریب کرنا چاہا ہے، ان کا خیال ہے کہ یہ کسی ہندی نام کی بگڑی ہوئی شکل ہے، مگر اس نکتہ پر ان کی نظر نہیں پڑی کہ یہ ہندی نہیں خالص عربی نام ہے، جو اس ہندی حکیم نے مسلمان ہونے کے بعد اختیار کرلیا تھا۔ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء میں ابراہیم صالح کے علاج کے سلسلے میں صالح کی جو گفتگو نقل کی ہے، اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا تھا۔ صالح کہتا ہے:

"اے امیر المؤمنین! تو امام ہے، اگر ایسا ہو (یعنی خدانخواستہ اگر ابراہیم کی اس شب میں موت ہو جائے) تو میرے تمام غلام خدا کی راہ میں آزاد اور میری تمام سواریاں خدا کی راہ میں وقف اور میرا تمام مال و اسباب مسکینوں کے لئے صدقہ اور میری سب بیویوں پر تین طلاقیں واقع ہوں۔" (طبقات الاطباء، ج۲، ص: ۳۴)

کیا یہ کسی غیر مسلم کی گفتگو ہو سکتی ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سندھ میں صرف عوام ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے وِدّان پنڈت اور پڑھے لکھے لوگ بھی اسلام کے اثر سے متاثر تھے۔

اس زمانہ میں مسلمانوں میں صرف دینی اور ادبی علوم رائج تھے، یعنی قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ اور شعر و ادب، چنانچہ سندھ کے نومسلموں نے ان فنون میں کامل دست گاہ پیدا کی، رجال کی کتابوں میں سندھ کے متعدد علماء اور محدثین کے نام ملتے ہیں۔ ابومعشر نجیح السندی، سندھ کے ایک غلام زادہ تھے، اپنے آقاؤں کے ساتھ سندھ سے عرب گئے، وہاں آزاد ہو گئے اور انہوں نے مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کرلی، کچھ دنوں کے بعد وہ اسی مدینہ کی نسبت سے مشہور ہوئے اور اب ابومعشر نجیح بجائے سندی کے مدنی کہلاتے ہیں، فن مغازی وسیر میں انہوں نے وہ کمال پیدا کیا کہ امام الفن کہلائے لیکن زبان سے سندیت نہ گئی، عربی صحیح مخارج سے ادا نہیں کر سکتے تھے، تاہم شاگردوں کا ٹھٹھ لگا رہتا تھا۔ ۱۷۰ھ میں انہوں نے جب وفات پائی تو فرماں روائے وقت خلیفہ ہارون رشید اس نومسلم سندھی عالم و امام فن کی نماز جنازہ کا امام تھا۔

ایک بزرگ رجاء السندی ہیں، جو عرب کے بجائے ایران پہنچے اور اسفرائینی ہو کر مشہور ہوئے، یہ فن حدیث کے باکمال استاد تھے۔ مشہور محدث حاکم ان کے بارے میں کہتے ہیں "رکن من ارکان الحدیث" یہ نہ صرف خود محدث تھے اور حافظ حدیث تھے بلکہ ان کے خاندان میں اور بہت سے حفاظ پیدا

ہوئے ،۲۲۱ھ میں وفات پائی۔

ابوعطاء السندی ایک ادیب گذرا ہے،جس کے فضل وکمال ادبیت کا شاہد صرف یہ واقعہ ہے کہ ابوتمام نے حماسہ میں ان کے اشعار داخل کئے ہیں، سندھی بن شاہک ایک سندھی بزرگ بغداد پہنچ کر بغداد کے پل پرفروکش ہوئے تھے،ان کی نسل سے کشاجم پیدا ہوئے ، جو عربی کا مشہور شاعر گذرا ہے۔ اورنصر فتح بن عبداللہ السندی ایک سندھی غلام تھے،تعلیم پا کر نکلے تو الفقیہ المتکلم بن گئے ۔(دیکھو انساب سمعانی لفظ''سندی'')

خاص ہندوستان میں جہاں اسلام کی سلطنت نہ تھی ، وہاں مسلمان تاجر موجود تھے، وہ بھی اپنے فرض (تبلیغ اسلام) سے غافل نہ تھے، ہندوستان میں کشمیر، ملتان اور کابل کے جغرافیائی حدود کے لحاظ سے وہ پنجاب ہی کا کوئی شہر ہوسکتا ہے۔معلوم نہیں اس کا اصلی لفظ ہندی تلفظ کیا ہے؟ (تاہم اپنے جغرافیائی حدود کے لحاظ سے وہ پنجاب ہی کا کوئی شہر ہوسکتا ہے) وہاں ایک بڑا بت خانہ تھا، اتفاق سے راجہ کا بیٹا بیمار پڑا، راجہ نے تمام پجاریوں کو بلا کر کہا کہ تم سب مل کر اس بڑے بت سے التجا کرو کہ وہ میرے بیٹے کو اچھا کردے۔ پجاری تھوڑی دیر کے بعد آئے اور اطلاع دی کہ ہم سب نے اس سے التجا کی اور اس نے کہا کہ یہ اچھا ہوجائے گا،لیکن لڑکا اس کے بعد ہی مرگیا۔راجہ کو اپنے مذہب سے سخت نفرت ہوگئی، بت خانہ کو ڈھایا، بودھ کی مورت کو توڑ دیا، پجاریوں کو قتل کرڈالا ،اس کے بعد اس کے ملک میں جو مسلمان تاجر تھے،ان کو بلوایا،ان تاجروں نے اس کے سامنے توحید پیش کی ،راجہ مسلمان ہوگیا۔(بلاذری،ص:۴۴۶)

ناممکن ہے کہ اس واقعہ کا اثر اس کی رعایا پر نہ پڑا ہو اور وہ اسلام سے متاثر نہ ہوئی ہو، یہ واقعہ معتصم باللہ المتوفی ۲۲۷ھ کے عہد حکومت کا ہے۔اسی طرح اسلام آہستہ آہستہ اپنا راستہ صاف کرتا چلا جاتا تھا،سندھ میں ساوندری نام ایک مقام تھا، خدا جانے اب ہے یا نہیں، یہاں کے باشندوں نے محمد بن قاسم کے زمانہ میں اسلام قبول کیا تھا مگر ایک شرط پر محمد بن قاسم نے ان سے صلح کر لی تھی اور وہ یہ تھی کہ مسلمان جب ان کے پاس سے گذریں تو وہ ان کی مہمانی کریں اور ان کو راستہ بتادیں،اس کے ڈیڑھ سو برس کے بعد بلاذری فتوح البلدان میں لکھتا ہے کہ'' آج ساوندری کے تمام باشندے مسلمان ہیں'' بلاذری نے اپنی یہ کتاب ۲۵۵ میں لکھی تھی۔

ہندی میں مذہب اسلام پر پہلا رسالہ

تیسری صدی کے آخر میں منصورہ سندھ کے پایۂ تخت میں عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز حاکم تھا،کشمیر بالا اور وزیریں کے بیچ میں الرا کا راجہ تھا جو ہندوستان کے تمام راجاؤں میں بڑا تھا،اس کا نام مہروگ اور اس کے باپ کا نام رایگ تھا، ۲۰۷ھ میں اس نے منصورہ کے حاکم کو لکھا کہ میرے پاس کسی ایسے شخص کو بھیج

دیجیئے جو مجھے ہندی زبان میں اسلام کی شریعت آ کر سمجھا دے، منصورہ میں ایک عالم عراق کے باشندے تھے، جو نہایت سمجھ دار، ہوشیار اور شاعر تھے اور ہندوستان میں مدت تک رہ جانے کے باعث یہاں کی زبانوں کو اچھی طرح جانتے تھے اور ان میں شعر تک کہتے تھے۔ عبداللہ بن عمر حاکم منصورہ نے ان کو بلوا کر راجہ کی خواہش سے ان کو مطلع کیا، انہوں نے ایک قصیدہ میں اسلام کے تمام ضروری مسائل کو لکھ کر نظم کر دیا اور اس کو راجہ کے پاس بھیج دیا، راجہ یہ قصیدہ سن کر بہت خوش ہوا اور عبداللہ کو لکھا کہ اس قصیدہ کے مصنف کو اس کے پاس بھیج دیا جائے، چنانچہ وہ عراقی عالم راجہ کے پاس گئے اور تین برس اس کی خدمت میں رہے، جب وہ راجہ کے یہاں سے لوٹ آئے تو عبداللہ نے راجہ کا حال پوچھا، انہوں نے اس کے حالات بیان کئے اور کہا میں نے اس کو اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ دل اور زبان دونوں سے مسلمان ہو چکا تھا، لیکن حکومت کے چھن جانے کے خوف سے وہ برملا اپنے اسلام کا اعلان نہیں کرتا۔

ہندی میں قرآن مجید کا پہلا ترجمہ

عالم عراقی نے بیان کیا کہ راجہ نے مجھ سے خواہش کی کہ ہندی زبان میں اس کو قرآن پاک کا ترجمہ سنایا کروں، چنانچہ سورہ یٰسین (۲۲واں پارہ) تک میں نے اس کو ہندی ترجمہ کر کے سنایا، ایک جگہ قرآن کی یہ آیت آئی: **قال من یحی العظام وھی رمیم. قل یحییھا الذین انشاھا اول مرۃ وھو بکل خلق علیم.** (سورۂ یٰسین: ۷۸)

کہنے لگا کون ان سڑی گلی ہڈیوں میں پھر جان ڈالے گا، کہہ دے وہی اس میں جان ڈالے گا جس نے ان کو پہلے پیدا کیا اور وہ سب بنانا جانتا ہے۔

جب میں نے راجہ کو اس آیت کا ترجمہ سنایا تو وہ ایک سونے کے تخت پر جس میں بیش قیمت جواہرات لگے تھے، بیٹھا تھا، اس نے سن کر کہا پھر اس کو دہرایئے، میں نے پھر دہرایا، وہ دفعۃً تخت سے اترا اور چند قدم چل کر ایک نم زمین پر جو پانی چھڑکنے سے تر تھی، اپنے گال رکھ دیئے اور خوب رویا، یہاں تک کہ اس کا چہرہ خاک آلود ہو گیا اور بے اختیار بول اٹھا کہ یہی وہ پہلا اور ازلی معبود ہے، جس کا سا کوئی ہنیں' انہوں نے کہا کہ راجہ نے ایک گھر بنا لیا ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ ایک خاص غرض کے لئے تنہائی چاہتا ہے، مگر وہ اس میں چھپ کر درحقیقت نماز پڑھتا ہے۔ (عجائب الہند، بزرگ بن شہریار ناخدا، مصنفہ ۲۸۸، طبع لیڈن، ص:۲)

تیسری صدی جب ختم ہو رہی تھی اور چوتھی صدی کا آغاز تھا کہ عراق کا سیاح مسعودی سندھ اور ملتان میں داخل ہوا، اس وقت سندھ کے تمام سیاسی روابط اور تعلقات بغداد کی مرکزی حکومت سے منقطع ہو چکے

تھے اور خود سندھ میں عربوں کی دو تین خود مختار ریاستیں پیدا ہوگئی تھیں اور باقی اسلامی مقبوضات پر ہندو راجہ دوبارہ قابض ہوگئے تھے، مگر وہ مسلمانوں کے مذہبی رسوم سے بالکل تعرض نہیں کرتے تھے، لیکن مسلمانوں سے ان کی سیاسی معرکہ آرائیاں قائم رہتی تھیں، وہ قنوج کی سلطنت کا ذکر کرتا ہے اور اس کے حدود یہ بتاتا ہے کہ شمال میں ملتان اور جنوب میں مانگیر (دکن) ہے اور کہتا ہے اس سلطنت کے شمال میں امیر ملتان اور جو اس کے ساتھ مسلمان ہیں ان سے لڑائی رہتی ہے۔

ملتان میں بنو اسامہ بن لوئی بن غالب ایک عرب قریشی خاندان کی حکومت ہے، اس کے پاس بڑی فوج اور قوت مدافعت ہے اور مسلمانوں کی سرحدوں میں سے ایک سرحد ہے اور اس سلطنت میں ایک لاکھ کے قریب گاؤں آباد ہیں، یہاں ہندوؤں کا ایک بڑا بت خانہ ہے، جس کی زیارت کو دور دور سے ہندو آیا کرتے ہیں اور اس پر نذر و نیاز چڑھایا کرتے ہیں اور بڑی دولت اس میں جمع ہوا کرتی ہے، جب کوئی راجہ ملتان پر حملہ کی تیاری کرتا ہے تو امیر ملتان دھمکی دیتا ہے کہ تم حملہ کروگے تو میں بت خانہ تباہ کردوں گا، اس ڈر سے حملہ آور واپس چلے جاتے ہیں۔

اس کا بیان ہے کہ سندھ میں اس وقت ایک اسلامی ریاست قائم ہے، جس کا صدر مقام منصورہ ہے اور میرے جانے کے وقت عمر بن عبداللہ (یہی وہ عبداللہ ہے جس نے راجہ الرا کے پاس عراقی عالم کو بھیجا تھا) حکمراں تھا اور اسی کے دربار میں ایک اور عرب امیر اور وہاں کے بادشاہوں میں ایک بادشاہ حمزہ سے بھی ملاقات ہوئی، یہاں سادات علویین کی بڑی تعداد ہے، ان کے علاوہ عرب اور اسلام کے بعض اور مشہور خاندان بھی آباد ہیں، منصورہ کا شاہی خاندان بنو عمر بن عبدالعزیز کہلاتا ہے، یہ عمر بن عبدالعزیز اموی نہیں، بلکہ ہبار بن اسود قریشی کی نسل سے عمر بن عبدالعزیز نام کے ایک دوسرے شخص کی اولاد ہیں۔ (مروج الذہب مسعودی، طبع یورپ، ج اول، ڈ:۳۷۴، ۳۷۷)

۳۰۳ھ میں وہ کھنبایت بھی جاتا ہے، جہاں مسلمان کی معتد بہ تعداد آباد تھی اور جہاں کا راجہ مناظرہ کا بڑا شائق تھا اور جب کوئی مسلمان اس کے پاس پہنچتا تھا تو اس سے مباحثہ کرتا تھا۔ (مروج الذہب مسعودی، ج اول، ص:۲۵۴)

مسعودی کے تقریباً ۵۷ برس کے بعد بشاری مقدسی بیت المقدس کا ایک مسلمان عالم ہندوستان کی سیاحت کو آتا ہے۔ ۳۷۵ھ کے گردوپیش میں وہ اپنا سفرنامہ ترتیب دیتا ہے، وہ سندھ کی سلطنت کو کئی حصوں میں منقسم پاتا ہے، وہ اس کی آس پاس کی سلطنتوں اور حکمرانوں کا بھی ذکر کرتا ہے، ملتان اور منصورہ کی اسلامی ریاستیں اس کے زمانہ قیام میں بدستور قائم تھیں، صرف اس قدر فرق تھا کہ ملتان اور منصورہ کی اسلامی

ریاست کا مذہب اسلامی شیعہ تھا، جس کے تعلقات براہِ راست مصر کے اسماعیلی فاطمی خلفاء کے ساتھ قائم تھے اور منصورہ کے بادشاہ اہل سنت تھے اور جو خلفائے بغداد کے نام کا خطبہ پڑھتے تھے، بشاری مقدسی نے بھی ملتان کے بت خانہ کا ذکر کیا ہے اور اس کی مورت کی جو کیفیت لکھی ہے، اس سے اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ یہ بودھ کی مورت تھی اور یہ بودھوں کا معبد تھا۔

بشاری دیہند نام سے ایک شہر کا نام لیتا ہے اور اس کی بڑی تعریف کرتا ہے، ابوالفداء بیرونی کے حوالہ سے تقویم البلدان میں دیہند کی نسبت لکھتا ہے کہ یہ گندھارکا پایۂ تخت ہے اور یہ وادی سندھ میں واقع ہے اور ادریسی کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ گندھار اور نہروالہ (قریب احمد آباد، گجرات) کے درمیان پانچ منزلوں کی مسافت ہے، ویسنٹ اے استھ صاحب دی ارلی ہسٹری آف انڈیا (ج ا ص:۳۴۵) میں اوہند نام کے دارالسلطنت کو دریائے سندھ پر جگہ دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ''مسلمانوں کے ۳۵۶ھ میں کابل فتح کر لینے کے بعد دارالسلطنت اوہند کو منتقل ہو گیا، جو دریائے سندھ پر واقع تھا اور یہ ہندوشاہیہ خاندان کا پایۂ تخت ہوا'' بہرحال چوتھی صدی کے آخر میں بشاری کا بیان ہے کہ یہاں آبادی کا بڑا حصہ غیر مسلم ہے، مگر یہاں تھوڑی سی تعداد مسلمانوں کی بھی ہے اور ان کی ایک الگ ریاست ہے۔ (احسن التقاسیم لمعرفۃ الاقالیم بشاری مطبوعہ لیڈن، ص:۴۸۵)

قنوج جن سے مراد غالباً وہ شمالی ہند کی پوری سلطنت ہے، جس کا پایۂ تخت قنوج تھا اور جس کے حدود میں اس زمانہ میں کشمیر، پنجاب، سندھ اور گجرات تک پھیلے ہوئے تھے، بشاری کہتا ہے کہ یہاں بھی مسلمانوں کی خاصی تعداد ہے، سلطنت گو ہندوؤں کی ہے اور غلبہ ان ہی کو حاصل ہے، مگر ایک چھوٹی سی الگ ریاست مسلمانوں کی بھی ہے۔ (حوالہ سابق، ص:۴۸۰)

پھر لکھتا ہے ''یہاں گوشت بہت ملتا ہے اور بہت سستا ملتا ہے، یہاں مسلمانوں کی زیادہ تر غذا گیہوں ہے اور یہاں علماء اور مسلمان معزز بھی ہیں اور جامع مسجد بھی ہے، جو شہر پناہ کے اندر واقع ہے۔'' (حوالہ سابق، ص:۴۷۹)

منصورہ کی نسبت لکھتا ہے کہ:

''یہ سندھ کا پایۂ تخت ہے، دمشق کے مثل ہے...... جامع مسجد بہت بڑی ہے، جو پتھر اور اینٹ سے بنی ہے، جیسی عمان کی جامع مسجد ہے، سال کے ستون ہیں اور چار دروازے ہیں...... یہاں کے باشندوں میں اسلام کی بڑی تازگی ہے اور علم بھی ہے، آبادی بہت ہے، تجارت کی گرم بازاری ہے...... غالب تعداد کفار کی ہے، دیبل (موجودہ کراچی) میں بھی وہ مسلمانوں کی تعداد کم بتاتا ہے، اسی طرح تنبل کے نسبت بھی کہتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی تعداد تھوڑی ہے۔'' (حوالہ سابق، ص:۴۷۹)

وزیر مہلبی جس نے چوتھی صدی ہجری میں اپنا جغرافیہ لکھا ہے، اس نے سندھ کے شہروں میں بیرون

نام شہر کے جو دیبل اور منصورہ کے بیچ میں تھا اور منصورہ سے پندرہ فرسنگ دور تھا، خالص اسلامی آبادی بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ''یہاں کے باشندے مسلمان ہیں، بعض لوگ مشہور مسلمان فلسفی اور ریاضی داں البیرونی کو جو بوعلی سینا کا ہم پلہ تھا اور جس نے ہندوؤں کے علوم پر سب سے مستند کتاب لکھی ہے اور سنسکرت کا بڑا عالم تھا، یہیں کا رہنے والا بتایا ہے۔ (تقویم البلدان ابوالفداء، طبع یورپ، ص:۳۴۸)

عام سندھ کی مذہبی حیثیت کے متعلق بشاری کا بیان ہے کہ:

''یہاں کی عام رعایا بت پرست ہے، یہاں واعظوں کا نام ونشان نہیں اور نہ وعظ گوئی کی یہاں اہمیت ہے، یہاں کے مسلمان عام طور سے اہل حدیث ہیں، یہاں کے قاضی ابومحمد منصوری کو میں نے داؤدی مذہب (ظاہری) کا پیرو پایا، یہ اپنے مذہب کے امام تھے اور یہ درس بھی دیتے تھے اور ان کی چند تصنیفیں بھی ہیں اور ملتان کے لوگ شیعہ ہیں...... بایں ہمہ ملک دوسرے فقہاء کے پیروؤں سے خالی نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ کے پیرو شہروں میں پائے جاتے ہیں، لیکن یہاں مالکی، حنبلی اور معتزلہ نہیں ہیں، ان کے عقائد اور طریقے اچھے ہیں۔'' (احسن التقاسیر لمعرفۃ الاقالیم بشاری مطبوعہ مطبوعہ لیڈن، ص:۴۸۱)

قصدار یا قزدار نام ایک مشہور شہر ہندوستان کی افغانی سرحد پر ملتان سے بیس منزل کی مسافت پر واقع تھا، محمود غزنوی نے چوتھی صدی کے اختتام پر اس کو فتح کیا، لیکن محمودی فتوحات سے پہلے وہ شہر محمدی فتوحات میں داخل ہو چکا تھا، غالباً چوتھی صدی کے وسط میں ایک معتزلی متکلم ومناظر ابوالحسن علی بن لطیف جب یہاں پہنچے ہیں تو انہوں نے دیکھا کہ یہاں خارجی مسلمانوں کی بڑی آبادی ہے، ان کی مسجد بھی ہے، بعض اہل حرفہ بھی ہیں، خوارج کا ایک امام بھی ہے، شہر میں بڑا امان ہے، چوری کا نام ونشان نہیں۔ (معجم البلدان یاقوت، رومی، طبع مصر، جلد ۷، ص:۸۷)

ان اقتباسات سے ظاہر ہوگا کہ اس سے پہلے کہ محمود غزنوی کی تلوار ہندوستان کی فضا میں غیظ وغضب کی بجلی بن کر گرے، ہندوستان کے متعدد گوشے اسلام کے نور سے روشن ہو چکے تھے اور اسلامی تمدن، اسلامی مذاہب، اسلامی طور وطریقے پھیل چکے تھے، یہاں تک کہ ان میں فرقہ بندیاں شروع ہو چکی تھیں اور اسلام کا یہاں کے معتبر اور مستند مذاہب میں شمار ہونے لگا تھا اور مسلمانوں کی تعداد کسی قدر کم سہی، مگر اس کا سلسلہ دریائے سندھ سے لے کر ایک طرف قنوج تک اور دوسری طرف ملتان، کشمیر اور قصدار تک پھیل چکا تھا اور یہاں کے راجاؤں میں اس کی طرف خاصہ میلان پیدا ہو گیا تھا۔ (معارف: جنوری، مئی واگست ۱۹۲۴ء)

❀❀❀

قسط (۲)

تفقہ فی الحدیث

اور

امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ

مولانا عبدالرشید صاحب بستویؒ
سابق استاذ حدیث، جامعہ امام محمد انور شاہ، دیوبند

تواتر کی چند دیگر اقسام

اصولِ حدیث کی کتابوں میں تواتر کی صرف ایک قسم مذکور ہے کہ ہر دور میں اس کے ناقلین اتنی بڑی تعداد میں اور ایسے لوگ ہوں جن کا اتفاق علی الکذب ناممکن ہو۔ تواتر کی اس قسم کو تواترِ اسناد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بقول علمائے اصولِ حدیث صرف تواتر اور متواتر ہی مفید علم و یقین ہے، باقی دیگر روایات جو صحیح، مشہور اور حسن ہوں، وہ محض مفید ظن و تخمین ہیں، نہ کہ مفید قطع و یقین۔ تواتر کے اس معیار پر پورے ذخیرہ احادیث میں ''**انما الأعمال بالنیات، من کذب عليّ متعمداً** اور **مسح علی الخفین**'' جیسی ہی چند احادیثِ مفید قطع و یقین نظر آتی ہیں، جب کہ احادیث کا بیشتر حصہ ظن و تخمین پر مشتمل ہونے کے باعث نہ صرف مشتبہ ہو جاتا، بلکہ دین اسلام کی تعلیمات ہی مخدوش ہو جاتی ہیں۔(۱)

حضرت امام العصر وہ عبقری محدث ہیں جنہوں نے تواتر اور متواتر کی مزید تین اقسام دریافت کیں اور اس طرح دین کا بڑا حصہ شبہ و ظن سے نکل کر علم و یقین کی حدود میں داخل ہو گیا۔ ۱-تواتر طبقہ ۲-تواتر قدر مشترک ۳-تواتر تعامل و توارث۔

۱-**تواتر طبقہ** : اس کا مطلب ہے کہ کسی چیز کو چند افراد دوسرے چند افراد سے نہیں؛ بلکہ پوری ایک جماعت دوسری پوری ایک جماعت سے نقل کرے۔ قرآن کریم اسی تواتر کے تحت نسلاً بعد نسلٍ عہد

(۱) پوری بحث رئیس القلم مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ کی تحریر ''احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن'' میں ملاحظہ کی جائے۔

نبوی سے ہم تک پہنچا ہے۔ اگر قرآن کریم کی ہر آیت کی بابت تواتر اسناد تلاش کیا جائے تو ایسا ممکن نہ ہوگا۔

۲-**تواتر قدر مشترک** : کا حاصل یہ ہے کہ کوئی بات چند سندوں وطرق کے ساتھ جزوی اختلاف کے ساتھ مذکور ہو۔ مگر ان سب طرق میں کوئی ایک بات مشترک طور پر پائی جاتی ہو تو ان میں ہر ایک طریق وحدیث فی نفسہ خواہ خبر واحد ہونے کے سبب مفید ظن ہو، مگر جو ایک بات قدرے مشترک طور پر سب میں مذکور ہے وہ متواتر اور مفید یقین ہو جاتی ہے۔ معجزات نبویؐ کا ثبوت اسی تواتر کے ذریعہ ہے۔

۳-**تواتر تعامل و توارث** : یہ ہے کہ دین کے کسی حکم پر عہد نبوت سے لے کر آج تک ہر زمانے میں مسلمانوں کا عمل رہا ہو۔ جیسے نماز کے ارکان، واجبات، سنن ومستحبات حتیٰ کہ رفع یدین وعدم رفع عہد اول سے تا امروز ہر زمانے میں مسلمانوں کا ان پر عمل رہا تو ان کا ثبوت اسی تواتر تعامل کے سبب قطعی ویقینی ہے۔(۱)

حدیث صحیح کی تقسیم

علماء اصولِ حدیث اور محدثین نے عام طور پر حدیث صحیح کی دو ہی اقسام بیان کی ہیں: ۱-صحیح لذاتہٖ ۲-صحیح لغیرہ۔ صحیح لذاتہ سے مراد وہ حدیث ہے جس کے تمام راوی عادل، ثقہ اور قوی الضبط ہوں، نیز وہ حدیث، انقطاع شذوذ اور علتِ قادحہ سے خالی ہو۔ جب کہ صحیح لغیرہ وہ حدیث ہے جس کے راویوں میں کوئی خفیف الضبط ہو، لیکن وہ حدیث تعدد طرق کے باعث قابلِ قبول ہونے کی وجہ سے صحیح کے درجہ میں آجائے۔(۲)

جب کہ کشمیری الامام نے ان کے علاوہ حدیث صحیح کی چار اقسام بیان کی ہیں اور ذخیرۂ احادیث میں ان کی مثالیں بھی بہ کثرت پائی جاتی ہیں:

۱-جس کے تمام راوی ثقہ وعادل، کامل الضبط والاتقان ہوں، وہ حدیث شذوذ اور کسی بھی علتِ قادحہ سے خالی ہو، نیز اس پر سلف کا عمل بھی رہا ہو۔ تعاملِ سلف کی قید صرف کشمیری الامام نے لگائی، اصحاب نظر پر اس کی اہمیت وافادیت مخفی نہیں۔

۲-وہ حدیث جس کی تصحیح کسی متفق علیہ امام حدیث نے کی ہو۔

---

(۱) تواتر کی ان اقسام کی مزید شرح وبسط کے لئے دیکھئے ''نفحۃ العنبر فی حیاۃ إمام العصر الشیخ انور'' تالیف: مولانا محمد یوسف بنوری، از ص: ۱۴۲-۱۴۵، مطبوعہ: بیت الحکمت، دیوبند

(۲) ملاحظہ ہو: نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر، تالیف: حافظ ابن حجر عسقلانیؒ

۳-صحیح روایات کی تخریج پر اکتفا کرنے والے کسی محدث نے اسے اپنی کتاب میں درج کیا ہو۔مثلاً صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان، صحیح ابن عوانہ وغیرہ۔

۴-وہ حدیث جس کے راوی جرح سے محفوظ ہوں اور ثقہ ہوں۔(۱)

ذخیرۂ احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ کشمیری الامام کی یہ چہارگانہ تقسیم نہایت اہم اور بڑی معنی خیز ہے۔

مناط کی تحقیق وتشریح

حضرت امام العصر الکشمیری نے مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی طرح، حدیث کی تشریح کے حوالے سے مناط کی تین بنیادوں کو ملحوظ رکھ کر ایسی بہت سی احادیث کا اس ذیل میں انطباق کیا جس کی طرف پہلے کسی کا ذہن نہ گیا۔ چنانچہ تحقیق مناط، تخریج مناط اور تنقیح مناط کے تحت گفتگو کرتے ہوئے ان کے مایہ ناز تلمیذ اور علوم انوری کے شارح وجامع محقق العصر مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوری لکھتے ہیں:

تحقیقِ مناط : ''یہ ہے کہ شریعت نے کسی جزئی صورت میں کوئی حکم دیا ہو، پھر وہ حکم اس نوع کی تمام جزئیات کے لئے ثابت کر دیا جائے، مثلاً حالتِ احرام میں اور حدودِ حرم میں شکار کرنے کی ممانعت ہے۔ اگر اس کی خلاف ورزی کرے تو اس پر بطور سزا شکار کردہ جانور کی قیمت لازم ہوگی، شکار کی قیمت کی تعیین تحقیقِ مناط کے قبیل سے ہے۔اس کے لئے محض تجربہ کافی ہے، اجتہادی صلاحیت کا پایا جانا ضروری نہیں۔''

تنقیح مناط : کا حاصل یہ ہے کہ شریعت نے کوئی حکم دیا، لیکن اس کی علت بیان نہ کی اور نہ ہی اس میں کوئی علت مذکور ہو، جب کہ اس میں کچھ ایسی صفات پائی جائیں جن میں سے بعض علت بن سکتی ہوں بعض نہیں۔ایسی جگہوں پر ایک مجتہد وفقیہ غور وفکر کر کے کسی ایک صفت کو حکم کی علت قرار دیتا ہے، پھر وہی حکم اس جیسی دیگر چیزوں پر منطبق کرتا ہے۔کشمیری الامام نے اس کے تحت حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ حدیث بھی ذکر کی ہے جس میں آتا ہے کہ ایک صحابی، رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے ''ھلکتُ'' آپ نے فرمایا کیا ہوا؟ عرض کیا میں نے ماہِ رمضان میں روزے کی حالت میں اہلیہ سے جماع کر لیا۔آپ نے ان کے لئے اس کے کفارہ کے طور پر تین چیزیں ذکر کیں:''**هل تجد ما تعتق رقبة؟ قال: لا. قال: فهل تستطيع أن تصوم شهرين متتابعين؟ قال: لا. قال: فهل تستطيع أن تطعم ستين**

(۱) دیکھئے: نفحۃ العنبر، ص:۱۴۴م۱۴۵، فائدہ:۴

مسکیناً؟ قال: لا الحدیث. اب امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ نے تنقیح مناط کرتے ہوئے وجوب کفارہ کی علت محض جماع کو نہیں بلکہ ہر عمل مفطر کو قرار دیا۔ لہٰذا اگر کوئی شخص روزے میں جان بوجھ کر کھا پی لے تو اس پر بھی یہی کفارہ واجب ہوگا۔ جب کہ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک مناطِ حکم جماع ہے، لہٰذا اکل وشرب موجب کفارہ نہ ہوں گے۔

تخریج مناط : یہ ہے کہ شریعت نے کسی چیز کی بابت کوئی حکم دیا ہو، لیکن اس کی علت بیان کی ہوا اور نہ ہی نص میں علت موجود ہو، جب کہ وہاں کچھ ایسی صفات پائی جائیں جن میں سے ہر ایک علت بن سکتی ہو۔ اب مجتہد وفقیہ غور وخوض کر اس حکم کی علت ومناط کی تخریج کرتا ہے جیسے اشیائے ستہ میں ربوٰ کی ممانعت وحرمت۔ اس حدیث میں چند اوصاف یکجا ہیں: قدر، جنس، از قبیلِ غذا ہونا، قیمتی ہونا اور قابلِ ذخیرہ ہونا۔ امام اعظمؒ نے اس کی علت ومناط قدر وجنس میں اتحاد کو قرار دیا۔ امام شافعیؒ نے ثمنیت اور قیمتی ہونے کو علت گردانا۔ جب کہ امام مالکؒ نے غذائیت اور ادخار کو علت بتایا۔(۱)

شرح حدیث کی بنیادیں

یہ بات ہر صاحب علم پر آشکارا ہے کہ کشمیری الامام کی دستارِ کمال میں کئی ایک بیش قیمت لعل وجواہر جڑے ہوئے تھے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ماضی قریب میں ان کے وجود بامسعود سے، علمی دنیا میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا تھا۔ تاہم آپ کی زندگی میں سب سے نمایاں عنوان آپ کا اجتہادی درسِ حدیث اور درسی خصوصیات و امتیازات ہیں۔ سابق ریاست مالوہ کے مفتی: مولانا محمود احمد نانوتویؒ یکے از تلامذہ امام العصرؒ کے بقول:

''ہندوستان نے حضرت شاہ ولی اللہ سے بڑھ کر کوئی مصنف اور مولانا انور شاہ سے ممتاز کوئی مدرس پیدا نہیں کیا۔''(۲)

۱-شرح حدیث عربیت کے اعتبار سے : کشمیری الامام ازروئے عربیت الفاظِ حدیث کی تشریح کرتے اور جو معنی اس کی رو سے درست ہوتا، اسے اختیار کرتے، جب کہ عربیت سے متصادم معنی کو رد کر دیا کرتے تھے۔

---

(۱) تنقیح مناط، تنقیح مناط اور تخریج مناط کی مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: نفحۃ العنبر ص:۴۷، ۵۷ اور نقشِ دوام، تالیف حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ، ص: ۴۵۰، ۴۵۱

(۲) نقشِ دوام، تالیف: مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیریؒ، ص: ۴۵، درس کی خصوصیات

حضرت امام العصر کے ایک عظیم المرتبت تلمیذ، متعدد علمی کتابوں کے مؤلف: حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ، اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

''درس حدیث میں سب سے اول اور زیادہ توجہ اس طرف کرتے تھے کہ حدیث نبوی کی مراد باعتبار قواعد عربیت اور بلاغت کے واضح ہوجائے۔ کوشش اس کی فرماتے کہ حدیث کی مراد کو اصطلاحات کے تابع نہ رکھا جائے۔ اصطلاحات بعد میں حادث ہوئیں اور حدیث نبوی زماناً و رتبۃً مقدم ہے۔ نیز جس طرح حضرات مفسرین قرآن کریم کے اسرارِ بلاغت بیان کرتے ہیں، اسی طرح شاہ صاحب حدیث کے بلاغی نکات پر متنبہ فرماتے۔''(۱)

۲-متعارض روایات میں تطبیق :مشکل اور متعارض احادیث کی تشریح کے ذیل میں کسی ایک روایت یا کسی ایک طریق پر انحصار نہ کرتے، بلکہ دوسری روایات وطرق میں وارد الفاظ کا تتبع و احصاء کرتے اور کوشش اس بات کی کرتے کہ ان کے درمیان اس لفظ تک پہنچ جائیں جسے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہو۔ اہل علم واقف ہیں کہ یہ کام کس قدر دشوار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ احادیث میں روایات بالمعنی بہت عام اور ذائع وشائع ہے۔(۲)

واضح رہے کہ روایت بالمعنی کے سبب بہت سے مسائل میں اختلافات پیدا ہوگئے کہ ہر فریق نے حدیث کے کسی طریق میں وارد ایک لفظ کا سہارا لیا، جب کہ دوسرے نے دوسرے طریق کے دوسرے لفظ کا۔ بنا بریں کشمیری الامام ایک روایت کے تمام طرق اور ان میں وارد مختلف الفاظ کو جمع کرتے اور روایت کی ایسی دل نشیں تشریح کرتے کہ دل باغ باغ ہوجاتے اور سننے والے بول اٹھتے کہ یہی منشائے رسالت اور مرادِ نبوت ہے۔(۳)

۳-جملہ علوم کا احاطہ : حضرت امام العصر کے ایک دوسرے شاگرد اور برصغیر کے ممتاز خطیب اور معروف عالم: حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ اپنے استاذ شہیر کی جامعیت درس پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''دوسری خصوصیت یہ تھی کہ حضرت ممدوح کے علمی تبحر اور علم کے بحرِ ذخار ہونے کی وجہ سے، درس صرف علوم حدیث ہی تک محدود نہ رہتا، اس میں استطراداً لطیف نسبتوں کے ساتھ ہر علم وفن کی بحث آتی تھی۔ اگر معانی و بلاغت کی بحث آجاتی تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا علم معانی کا یہ مسئلہ اسی حدیث کے لئے

(۱) حیاتِ انور، ۱/۱۴۶، درسِ حدیث، مضمون مولانا کاندھلوی، بہ عنوان: حضرت الاستاذ محدث کشمیریؒ
(۲) نفحۃ العنبر، ص:۶۱، خصائصه و مميزاته فی شرح الأحاديث التی تتعلق بمسائل مذاهب الأئمة وغيرها
(۳) ایضاً، ص:۶۱، خصائصه و مميزاته فی شرح الأحاديث التی تتعلق بمسائل مذاهب الأئمة وغيرها

واضع نے وضع کیا تھا۔ معقولات کی بحثیں آجاتیں اور معقولیوں کے کسی مسئلہ کا رد فرماتے تو اندازہ ہوتا کہ یہ حدیث گویا معقولات ہی کی تردید کے لئے قلبِ نبوی پر وارد ہوئی تھی۔''(۱)

حضرت حکیم الاسلامؒ کشمیری الامام کے درسِ حدیث کے امتیازات اور درس سے اپنے طریقۂ استفادہ و انتفاع کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

''میں نے ان مختلف الانواع تحقیقات کو دیکھ کر ایک املائی کاپی تیار کی جس کے چوڑے اوراق میں چھ سات کالم بنائے اور ہر کلام کے اوپر والے سرے پر فنون کے عنوان ڈال دیئے، یعنی مباحثِ تفسیر، مباحثِ حدیث، مباحثِ عربیت، صرف ونحو، مباحثِ فلسفہ ومنطق، مباحثِ ادبیات جن میں اشعارِ عرب اور فصاحت وبلاغت کی بحثیں آتی تھیں، مباحثِ تاریخ وغیرہ۔ پھر فنونِ عصریہ کے لئے ایک کالم رکھا، کیوں کہ موجودہ دور کے فنون جیسے: سائنس، فلسفہ، جدید اور ہیئتِ جدیدہ وغیرہ کے مباحث بھی بہ ذیل بحثِ حدیث، درس میں آتے تھے۔''(۲)

۴- **متقدمین کا تعارف و تذکرہ**: کشمیری الامام کی جامعیتِ درس کی ایک امتیازی شان تھی، متقدمین اصحابِ فضل وکمال کا وقیع تعارف، ان کی زندگی کے درخشاں پہلوؤں سے نقاب کشائی اور ان کی جلالتِ شان کا بصیرت افروز تذکرہ۔ کشمیری الامام کے ایک ممتاز شاگرد رئیس القلم: حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ کشمیری الامام کی اس درسی خصوصیت کا تعارف اس طرح کراتے ہیں:

''علاوہ موضوعِ درس کے چند خاص امور کا تذکرہ التزاماً اپنے درس میں ضرور فرمایا کرتے۔ مثلاً: جن مصنفین کی کتابوں کا حوالہ دیتے ان کی ولادت و وفات سنین کے ساتھ ساتھ مختصر حالات، ان کی علمی خصوصیت، علم میں ان کا خاص مقام کیا ہے، ان امور پر ضرور تنبیہ کرتے چلے جاتے۔''(۳)

اس سلسلے میں مزید معلومات دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اشخاص ورجال جن کا وہ تذکرہ حلقۂ درس میں فرمایا کرتے تھے، ان میں زیادہ تر ایسی ہستیاں تھیں جواب دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ زندہ علماء کا ذکر مشکل ہی سے ان کے درس میں ہوتا اور زندہ کیا سچ پوچھئے تو حافظ ابن حجر، نویں صدی ہجری کے عالم ومحدث کے بعد والوں کے نام بھی ان کی زبانِ مبارک پر اتفاقاً ہی

(۱) حیاتِ انور، ۱/۲۴۰، ۲۴۱، نور الانور، تحریر: حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ

(۲) حیاتِ انور، ۱/۲۴۰، ۲۴۱، نور الانور، تحریر: حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ

(۳) حیاتِ انور، ۱/۶۸، حضرت شاہ صاحب کی درسی خصوصیات

کبھی آتے ہوں۔ان کے حلقۂ درس میں پہنچ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ درمیان کی چند صدیاں گویا حذف ہوگئی ہیں اور ہم نویں، آٹھویں اور ان سے پہلے کی صدیوں میں زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔''(۱)

۵-استحکامِ حنفیت :اس ذیل میں کشمیری الامام کی مساعی بڑی وقیع اور ناقابل فراموش ہیں۔ان کے درس اور تالیفات سے استفادہ کرنے والا اس یقین سے سرشار ہوتا ہے کہ مختلف فیہ مسائل میں دوسرے مسلک والوں کے پاس جس درجہ کی روایت ہے، اس سے بہتر یا کم از کم اس درجہ کی روایت احناف کا بھی مستدل ہے۔کشمیری الامام نے دیوبند میں آخری درسِ حدیث کے سال ماہِ شعبان میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''ہم نے اپنی زندگی کے پورے تیس سال اس مقصد کے لئے صرف کئے کہ فقہ حنفی کے موافقِ حدیث ہونے کے بارے میں اطمینان حاصل ہوجائے۔سوالحمدللہ اپنی تیس سالہ محنت اور تحقیق کے بعد، میں اس بارے میں مطمئن ہوں کہ فقہ حنفی حدیث کے مخالف نہیں ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جس مسئلہ میں مخالفین احناف، جس درجہ کی حدیث سے استناد کرتے ہیں، کم از کم اس درجہ کی حدیث اس مسئلہ کے متعلق، حنفی مسلک کی تائید میں ضرور موجود ہے اور جس مسئلہ میں حنفیہ کے پاس حدیث نہیں ہے اور اس لئے وہ اجتہاد پر اس کی بنیاد رکھتے ہیں، وہاں دوسروں کے پاس بھی حدیث نہیں ہے۔''(۲)

۶-مسائل فقهيه كا استنباط :کشمیری الامام کے درس حدیث کا نمایاں پہلو فقہی مسائل پر بصیرت افروز گفتگو تھی۔آپ جس بالغ نظری اور دقیقہ رسی سے گفتگو کرتے، اس سے محسوس ہوتا کہ فقہ حنفی کے مسائل خود بخود احادیث سے نکل رہے ہیں۔اس کے لئے کسی درجہ میں بھی تکلف اور آورد محسوس نہ ہوتا تھا۔حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کی شہادت ملاحظہ ہو:

''متونِ حدیث کی معتبر کتابوں کا ڈھیر آپ کے سامنے ہوتا تھا اور تفسیر حدیث بالحدیث کے اصول پر کسی حدیث کے مفہوم کے بارے میں جو دعویٰ کرتے، اسے دوسری احادیث سے مؤید اور مضبوط کرنے کے لئے، درس ہی میں کتب پر کتب کھول کر دکھاتے جاتے تھے اور جب ایک حدیث کا دوسری احادیث کی واضح تفسیر سے مفہوم متعین ہوجاتا تھا تو نتیجتاً وہی فقہ حنفی کا مسئلہ نکلتا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ حدیث فقہ حنفی کو پیدا کر رہی ہے، یہ ہرگز معلوم نہیں ہوتا تھا کہ فقہ حنفی کی تائید میں خواہ مخواہ توڑ موڑ کر حدیثوں کو

(۱)حیاتِ انور،۱/۸۷،۹۷،حضرت شاہ صاحب کی درسی خصوصیات

(۲)الانور،ص:۳۱۴،فقہ حنفی کے بارے میں اطمینان،حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری،تحریر:مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ

پیش کیا جارہا ہے۔''(۱)

۷- عرض الحدیث علی القرآن : کشمیری الامام کے درسِ حدیث کا ایک ممتاز وصف ''عرض الحدیث علی القرآن'' تھا۔ ظاہر ہے کہ حدیث نبوی، حسبِ تصریح قرآن کریم، علوم کتاب اللہ ہی کی تشریح وتفصیل ہے۔ کشمیری الامام دورانِ درس یہ بتاتے جاتے تھے کہ زیر بحث حدیث، قرآن کی کس آیت کی تشریح وتوضیح ہے اوراس کا ماخذ کون سی آیت ہے۔ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ لکھتے ہیں:

''حدیث نبوی کا ماخذ قرآن کریم سے بیان فرماتے اوراس مناسبت سے بہت سی مشکلات قرآنیہ کو حل فرمادیتے تھے۔''(۲)

۸- تطبیق وتوفیق : کشمیری الامام کے درسِ حدیث کی اہم خصوصیت ''**تطبیق بین الروایات المتعارضة**'' اور ''**توفیق بین اقوال الأئمة المختلفة**'' ہے۔ کشمیری الامام کی ہرممکن یہ کوشش ہوتی کہ بہ ظاہر متعارض احادیث کی ایسی تشریح کی جائے اوران کا ایسا محمل ومنشاء خود روایات ہی کی روشنی میں متعین کیا جائے جس سے یہ روایات نہ صرف یہ کہ باہم متعارض نظر نہ آئیں، بلکہ ایک دوسرے کے لئے معاون ومتابع بھی ثابت ہوجائیں۔ اسی طرح ائمہ مجتہدین کے مختلف فیہ اقوال میں بھی توفیق وجمع کی کوشش کرتے اورعلی وجہ البصیرت یہ ثابت کرتے کہ ان کے درمیان اتفاق کے اجزاء اختلافی نکات کی بہ نسبت زیادہ ہیں۔ اس ذیل میں آپ کو اگر حنفیہ کا کوئی قول نہ ملتا تو دوسرے ائمہ کا قول اختیار کرتے، خصوصاً امام شافعیؒ کا۔(۳)

اس حوالے سے حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی لکھتے ہیں:

''ایک موقع پر شاہ صاحب نے فرمایا اکثر مسائل میں فقہ حنفی میں کئی کئی اقوال ہیں اورمرجحین واصحابِ فتویٰ مختلف وجوہ واسباب کی بناپر ان میں سے کسی ایک قول کو اختیار کرتے اورترجیح دیتے ہیں۔ میں اس قول کو زیادہ وزنی اورقابلِ ترجیح سمجھتا ہوں جواز روئے دلائل زیادہ قوی ہو یا جس کے اختیار کرنے میں دوسرے ائمۂ مجتہدین کا اتفاق زیادہ حاصل ہوجاتا ہو۔''(۴) (جاری)

❀❀❀

(۱) حیاتِ انور، ۱/۲۳۷، نور الانور
(۲) مقدمہ انوار الباری، ۲/۲۴۴، حضرت شاہ صاحب کے درسِ حدیث کی خصوصیات
(۳) نفحۃ العنبر، ص:۵۵، خصائصه و مميزاته في شرح الأحاديث التي يتعلق بمسائل مذاهب الأئمة وغيرها
(۴) حیات انور، ۱/۱۶۸، فقہ میں آپ کا ایک خاص اصول

رمضان کی فضیلت

مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خاں صاحب مفتاحی
بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

رمضان کی فضیلت بہت سی حدیثوں سے ثابت ہوتی ہے، چند یہ ہیں:

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضرت رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: اِذَا دَخَلَ شَهْرُ رَمَضَانَ فُتِحَتْ اَبْوَابَ السَّمَاءِ وَ غُلِّقَتْ اَبْوَابَ جَهَنَمَ وَ سُلْسِلَتِ الشَّيٰطِيْنَ. (بخاری:۱۷۶۶)

(جب رمضان کا مہینہ داخل ہوتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے۔)

ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ حضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اِذَا جَاءَ رَمَضَانُ فُتِحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّة'' (بخاری:۱۷۶۵، مسلم ۱۷۹۳)

(جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔)

حضرت عبادہ ابن الصامتؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ جب کہ رمضان آچکا تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''رمضان کا مہینہ آگیا ہے، جو بڑی برکت والا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ تمہیں (اپنی رحمت سے) ڈھانپ لیتے ہیں، تم پر رحمت نازل فرماتے ہیں، خطاؤں کو معاف کرتے ہیں اور دعاؤں کو قبول کرتے ہیں اور تمہارے تنافس (ایک دوسرے سے نیکیوں میں آگے بڑھنے) کو دیکھتے ہیں اور ملائکہ پر فخر فرماتے ہیں، پس تم اللہ تعالیٰ کو نیکی دکھاؤ، بدنصیب ہے وہ شخص جو اس مہینہ میں بھی اللہ کی رحمت سے محروم رہ جائے۔ (مسند الشامیین للطبرانی:۳/۲۷۱، الترغیب:۲/۹۹)

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر دن ورات میں (جہنم کے) قیدی آزاد کئے جاتے ہیں، یعنی رمضان میں اور ہر مسلمان کے حق میں ہر دن ورات میں ایک دعا ضرور قبول کی جاتی ہے۔ (الترغیب:۲/۱۰۳)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اَتَاكُمْ شَهْرُ رَمَضَانَ شَهْرٌ مُبَارَكٌ فَرَضَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ صِيَامَه، تُفْتَحُ فِيْهِ اَبْوَابُ السَّمَاءِ وَ تُغْلَقُ فِيْهِ اَبْوَابُ الْجَحِيْمِ وَ تُغَلُّ فِيْهِ مَرَدَةُ الشَّيَاطِيْنِ، فِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِنْ اَلْفِ شَهْرٍ، مَنْ حُرِمَ خَيْرُهَا فَقَد حُرِمَ. (نسائی:۲۱۰۶، مسنداحمد:۸۹۷۹، الترغیب:۹۸/۲)

(تمہارے پاس ماہ رمضان آچکا ہے، وہ ماہِ مبارک جس کے روزے اللہ نے تم پر فرض کئے ہیں، اس ماہ میں آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور شریر شیاطین کو بیڑی ڈال دی جاتی ہیں، اس ماہ میں ایک رات ایسی ہے جو ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے، جو اس کے خیر سے محروم کردیا گیا وہ واقعی محروم ہوگیا۔)

ان چند احادیث سے رمضان مبارک کی فضیلتوں و بزرگیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

رمضان کی خصوصیات

ماہِ رمضان مبارک بے شمار خصوصیتوں کا حامل ہے اور یہ خصوصیات کسی اور ماہ کو حاصل نہیں ہیں، اسی لئے اس ماہ کو سب سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک لمبی حدیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "مَا مَرَّ بِالْمُسْلِمِيْنَ شَهْرٌ خَيْرٌ لَّهُمْ مِّنْهُ" (صحیح ابن خزیمہ:۱۸۸/۳)

(مسلمانوں پر کوئی مہینہ اس (رمضان) سے زیادہ بہتر نہیں گزرا)

الغرض ماہ رمضان بڑی خصوصیات کا مہینہ ہے، یہاں ان میں سے بعض کا ذکر کیا جاتا ہے:

اجر وثواب میں زیادتی

رمضان میں اعمال کا ثواب عام دنوں کے اعتبار سے بہت زیادہ عطا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت سلمان فارسیؓ کی لمبی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس مہینہ میں نفل عبادت کر کے اللہ کا قرب حاصل کرنا چاہے وہ اس شخص کے مانند ہے جو اور دونوں میں فرض ادا کرے اور جو اس مہینہ میں ایک فرض ادا کرے، وہ اس آدمی کے مثل ہوگا جو دوسرے دنوں میں ستّر (۷۰) فرض ادا کرے۔ (صحیح ابن خزیمہ:۱۹۱/۳، شعب الایمان:۳۰۵/۳، مسند الحارث ۴۱۲/۱)

جنت کے دروازوں کا کھل جانا اور دوزخ کے دروازوں کا بند ہو جانا

جیسا کہ اوپر احادیث گذر چکی ہیں کہ رمضان آتا ہے تو دوزخ کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور جنت کے کھول دیئے جاتے ہیں۔

شیاطین کا بند ہو جانا

حدیث میں ہے کہ رمضان میں شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے جیسا کہ اوپر گزرا اور اس سے وہ شیاطین اور جن مراد ہیں جو لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور بہکاتے ہیں، کیوں کہ ایک حدیث میں اس کی تصریح کی گئی ہے۔اس ماہ میں ان شریر جنات وشیاطین کو بند کر دیا جاتا ہے کہ وہ اب اس قابل نہیں رہتے کہ لوگوں کو گمراہ کر سکیں۔اب رہا یہ سوال کہ بہت سے لوگ رمضان میں بھی گمراہ ہوتے یا گمراہ رہتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟اس کا جواب یہ ہے کہ یا تو نفس کے بہکانے کی وجہ سے ہے یا شیاطین کے ان اثرات کا نتیجہ ہے جو سال بھر لوگوں کے ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان میں پیوست ہو گئے تھے اور اب اثر انداز ہوتے ہیں۔

قرآن کا اسی ماہ میں نازل ہونا

رمضان المبارک کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسی مہینہ کو اللہ نے قرآن پاک کے نازل کرنے کے لئے منتخب فرمایا، چنانچہ قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ. (البقرہ:۱۸۵)

(کہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا)

لیلۃ القدر کا آنا

ایک خصوصیت رمضان کی یہ بھی ہے کہ لیلۃ القدر جو ہزار مہینوں سے افضل ہے، وہ اسی مہینہ میں آتی ہے۔حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس مہینہ میں ایک رات آتی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔(نسائی:۲۱۰۶،مسند احمد:۷/۱۴۸)

رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرامؓ کا رمضان

اب ہم رمضان المبارک میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے معمولات اور جدوجہد کا ذکر کرتے ہیں تاکہ ان حضرات کے اسوہ پر چلنے کی رغبت پیدا ہو۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ:

”کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا دَخَلَ رَمَضَانَ شَدَّ مِئْزَرَهٗ ثُمَّ لَمْ یَأْتِ فِرَاشَهٗ حَتّٰی یَنْسَلِخَ“(صحیح ابن خزیمہ ۳/۳۴۲،شعب الایمان:۳/۳۱۰،واسنادہ حسن کما فی اعلاء السنن:۲/۲۱)

(جب رمضان داخل ہوجاتا تو رسول اللہ ﷺ اپنی ازار کو سخت باندھتے، پھر جب تک رمضان گذر نہ جاتا آپ بستر پر نہ آتے تھے۔

فـــائـدہ :ازار کو سخت باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ پورے اطمینان سے عبادت میں مشغول ہوجاتے تھے، یہ عبادات میں جدوجہد کرنے سے کنایہ ہے اور بعض علماء نے فرمایا کہ یہ عورتوں (ازواج مطہرات) سے علیحدہ رہنے سے کنایہ ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ بیک وقت اس سے دونوں باتیں مراد ہوں۔(شرح مسلم للنووی:۱/۳۷۲،فتح الباری:۴/۲۶۹،نیل الاوطار:۴/۳۶۲)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کا پورا مہینہ عبادت میں پورے انہماک کے ساتھ مشغول رہتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ ''**إذا دَخَلَ رَمَضَانُ تَغَيَّرَ لَوْنُهُ وَكَثُرَتْ صَلٰوتُهُ وَابْتَهَلَ فِي الدُّعَاءِ وَ اَشْفَقَ مِنْهُ.**'' (شعب الایمان:۳/۳۱۰)

(جب رمضان آتا تو رسول اللہ ﷺ کا رنگ بدل جاتا اور آپ کی نماز زیادہ ہوجاتی اور آپ دعا میں گڑگڑاتے اور رمضان کی حرص کرتے)

اس سے معلوم ہوا کہ رمضان میں آپ کثرت کے ساتھ نماز پڑھتے اور دعائیں کرتے تھے، اور ظاہر ہے کہ نماز سے یہاں نفل نماز ہی مراد ہے، کیوں کہ فرائض وواجبات تو مقرر ہیں، ان میں نہ کمی ہوسکتی ہے نہ زیادتی۔ اور رنگ بدل جانے کے دو مطلب ہوسکتے ہیں، ایک تو یہ کہ کثرت، عبادات کی وجہ سے اور پے در پے روزوں کی وجہ سے آپ کا رنگ متغیر ہوجاتا، جیسا کہ عام طور پر مجاہدہ وریاضت کرنے سے ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ حالت بدل جانے سے کنایہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عام دنوں کی حالت سے رمضان میں آپ کی حالت دوسری ہوتی کہ عام دنوں میں اتنی کثرت سے نمازیں اور دعائیں نہ ہوتیں، جیسے رمضان میں ہوتیں، ہمارے محاورے میں بھی بولتے ہیں کہ فلاں کا رنگ ہی بدل دیا گیا، یعنی حالت بدل گئی اور حرص کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رمضان میں نیکیوں کی حرص کرتے تھے۔ (واللہ اعلم)

حضرت عائشہؓ ہی فرماتی ہیں کہ ''**كَانَ النَّبِيّ ﷺ يَجْتَهِدُ فِي الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مَالاَ يَجْتَهِدُ فِي غَيْرِهَا**۔(مسلم:۲۰۰۹،ترمذی:۷۲۶،ابن ماجہ:۱۷۵۷،احمد:۲۳۷۶۶،ابن خزیمہ:۳/۳۴۲)

آپ آخری عشرہ میں اتنی جدوجہد (عبادت میں) کرتے تھے کہ دوسرے دنوں میں اتنی نہیں کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ خاص طور پر آخری عشرہ میں بڑا مجاہدہ فرمایا کرتے تھے حتی کہ اپنے اہل خانہ

کو بھی عبادات کے لئے جگا دیا کرتے تھے۔

حضرت زینب بنت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "**لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا بَقِيَ مِنْ رَمَضَانَ عَشَرَةٌ. أَيَّامٍ يَدَعُ أَحَدًا مِنْ أَهْلِهِ يُطِيقُ الْقِيَامَ إِلَّا أَقَامَهُ.**" (ذكره الحافظ عن الترمذی فی الفتح: ۲۶۹/۴، و كذا ذكره الشوكاني في النيل والمباركبوري في تحفة الاحوذي، ولكني لم اجده فيه ولا فيما عندي من كتب الحديث)

(جب رمضان کے دس دن باقی رہ جاتے تھے تو آپ اپنے گھر والوں میں سے کسی ایسے شخص کو اٹھائے بغیر نہ چھوڑتے جو اٹھنے کی طاقت رکھتا)

حضرت عائشہؓ ابن عمر و ابوسعید خدری اور انس رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین وغیرہ سے مروی ہے کہ آپ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے اور یہ سلسلہ وفات تک جاری تھا۔ (بخاری: ۱۸۸۵، ۱۸۸۷، مسلم: ۲۹۹۲، ترمذی: ۷۲۰، ابن خزیمہ: ۳۴۶/۳، ابن حبان: ۲۲/۸)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ "**كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُوقِظُ أَهْلَهُ فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ**" (ترمذی: ۷۲۵، مسند بزار: ۳۰۰/۲، مسند احمد: ۷۴۲)

(رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اپنے گھر والوں کو جگا دیا کرتے تھے)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ تمام اوقات سے زیادہ رمضان میں سخی ہو جاتے تھے، جب جبرئیل آپ سے ملتے تھے اور جبرئیل رمضان کی ہر رات میں آپ سے ملتے تھے، یہاں تک کہ رمضان گذر جاتا۔ نبی کریم ﷺ انہیں قرآن سنایا کرتے تھے۔ غرض جب جبرئیل علیہ السلام آپ سے ملتے تھے تو آپ تیز ہوا سے بھی زیادہ نیکی میں سخی ہو جاتے تھے۔ (بخاری: ۱۷۶۹، مسلم: ۴۲۶۸، نسائی: ۲۰۶۸، احمد: ۳۲۵۰، ابن خزیمہ: ۱۹۳/۳، ابن حبان: ۲۲۵/۸)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ رمضان میں سخاوت و خیرات بہت زیادہ کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ آپ رمضان میں قرآن پاک کے سنانے میں اہتمام فرماتے تھے، بعض روایات میں ہے کہ آپ ہر سال رمضان میں حضرت جبرئیل کو قرآن کا وہ حصہ جو نازل ہو چکا ہوتا سنایا کرتے تھے اور آخر سال آپ نے دو مرتبہ قرآن سنایا۔ (مسند عبد بن حمید: ۲۱۷/۱، شعب الایمان: ۴۱۴/۲)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ رات کے درمیانی حصہ میں باہر نکلے اور مسجد میں نماز پڑھی اور آپ کے ساتھ چند لوگوں نے بھی نماز پڑھی، صبح لوگوں نے اس کا تذکرہ کیا اور دوسری رات اس

سے زیادہ لوگ جمع ہوگئے، آپ نے نماز پڑھی اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھی، پھر صبح اس کا چرچا ہوا تو تیسری رات بہت لوگ جمع ہوگئے، آپ نے اس رات بھی نماز پڑھائی اور لوگوں نے نماز پڑھی اور چوتھی رات اس قدر مجمع ہوگیا کہ مسجد میں گنجائش نہ رہی مگر آپ اس رات نہیں آئے اور فجر کی نماز کے لئے تشریف لائے اور نماز کے بعد فرمایا کہ میں تم لوگوں کے یہاں موجود ہونے سے بے خبر نہیں تھا، مگر مجھے خوف واندیشہ ہوا کہ کہیں یہ تم پر فرض نہ ہوجائے اور تم اس کو ادا نہ کرسکو۔ (بخاری:۳/۱۸۷، مسلم:۱/۲۱۷، نسائی:۱۵۸۶، ابوداؤد:۱۱۶۶، احمد:۲۳۱۹۴)

یہ چند روایتیں ہیں جن سے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا معمول رمضان میں معلوم ہوتا ہے۔

عشرۂ اخیرہ کی فضیلت

ایک طویل حدیث میں جس کو حضرت سلمان فارسیؓ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شعبان کے آخری دن خطبہ دیا اور اس میں ایک بات یہ بھی فرمائی ”وَهُوَ شَهْرٌ اَوَّلُهُ رَحْمَةٌ وَ اَوْسَطُهُ مَغْفِرَةٌ وَّ آخِرُهُ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ.“ (اخرجہ ابن خزیمہ فی صحیحہ:۳/۱۹۱، والبیھقی فی شعب الایمان:۳/۲۰۵، عن سلمان الفارسی فی حدیث طویل)

(ماہِ رمضان وہ مہینہ ہے کہ اس کا ابتدائی حصہ رحمت، درمیانی حصہ مغفرت اور آخری حصہ آگ سے آزادی وخلاصی ہے)

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ رمضان کے تین حصے قرار دیئے گئے ہیں، اول، اوسط اور آخر اور یہ دس دس ایام پر مشتمل ہوں گے، یا پہلا اور اوسط حصہ دس دس ایام کا اور آخری حصہ نو ایام کا ہوگا، پھر پہلے عشرے کو رحمت کا، دوسرے کو مغفرت کا اور تیسرے کو یعنی آخری حصہ کو دوزخ سے خلاصی کا قرار دیا ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کاندھلویؒ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ ”آدمی تین طرح کے ہوتے ہیں: ایک وہ جن پر گناہوں کا بوجھ نہیں، ان کے لئے شروع ہی سے رحمت وانعام کی بارش ہوجاتی ہے، دوسرے وہ لوگ جو معمولی گناہگار ہیں، ان کے لئے کچھ حصہ روزہ رکھنے کے بعد ان کے روزوں کی برکت اور بدلے میں گناہوں کی معافی ہوتی ہے، تیسرے وہ جو زیادہ گناہگار ہیں، ان کے لئے زیادہ حصہ روزہ رکھنے کے بعد آگ سے خلاصی ہوتی ہے۔ (فضائل رمضان:۱۱)

حضرت مولانا منظور احمد نعمانی علیہ الرحمہ نے بھی اپنی مایہ ناز کتاب ”معارف الحدیث“ میں اسی شرح کو اختیار فرمایا ہے۔ (معارف الحدیث:۵/۱۰۳)

اس تشریح کے مطابق ثابت ہوا کہ رمضان کا آخری عشرہ بڑے سے بڑے گناہگاروں کے لئے بھی مغفرت کا پیغام لے کر آتا ہے، اس میں رمضان کے آخری عشرہ کی کتنی بڑی فضیلت نکلتی ہے؟ جو لوگ اپنی سال بھر کی بداعمالیوں کی وجہ سے جہنم کے مستحق ہو چکے ہوتے ہیں، اگر وہ رمضان میں روزوں اور تراویح اور دیگر عبادات کے ذریعہ جہنم سے آزاد ہو جانا چاہیں تو ان کو یہ بات ضرور حاصل ہوگی۔

یہاں ایک بات طالب علمانہ نکتہ کی حیثیت سے عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ حدیث کی جو تشریح ان بزرگوں نے فرمائی ہے، اس پر بظاہر ایک اشکال ہوتا ہے، وہ یہ کہ حدیث میں دوسرے عشرہ کو مغفرت اور تیسرے کو دوزخ سے آزادی کا وقت قرار دیا ہے۔ اگر اس کا یہ مطلب لیا جائے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ معمولی گناہگاروں کو دوسرے عشرے میں مغفرت کا پروانہ مل جاتا ہے اور جو بہت بڑے گناہگار ہیں، ان کو تیسرے عشرے میں دوزخ سے خلاصی مل جاتی ہے تو مغفرت اور دوزخ سے آزادی کے مفہوم میں کوئی فرق فی الواقع نہیں رہے گا، دونوں کا حاصل ایک ہوگا کہ بعض کی مغفرت دوسرے عشرے میں اور بعض کی مغفرت دوسرے عشرے میں اور بعض کی مغفرت تیسرے عشرے میں ہوگی۔ اس لئے احقر کی رائے یہ ہے کہ مغفرت کا تعلق چھوٹے گناہوں سے مانا جائے اور دوزخ سے آزادی کا تعلق بڑے گناہوں سے مانا جائے اور یہ مطلب لیا جائے کہ جو لوگ گناہ صغیرہ کے مرتکب ہیں، ان کی دوسرے عشرے میں مغفرت کر دی جائے گی اور جو کبیرہ گناہ کے مجرم ہیں، ان کی آخری عشرے میں معافی ہوگی۔

اب حاصل اس حدیث کا یہ ہے کہ دوسرے عشرے میں تمام لوگوں کے وہ گناہ بخش دیئے جاتے ہیں جو صغیرہ ہوں، مگر صرف صغیرہ گناہوں کی معافی سے ظاہر ہے کہ دوزخ سے خلاصی حاصل نہیں ہوتی۔ لہٰذا تیسرے عشرے میں بڑے بڑے گناہوں کی معافی بھی ہو جاتی ہے اور دوزخ سے بالکلیہ آزادی و نجات مل جاتی ہے۔

بہرحال اس حدیث سے آخری عشرہ کی ایک اہم ترین فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ بدبخت سے بدبخت آدمی بھی اگر اس ماہ میں ان نیکیوں میں لگا رہے تو اس کی بھی نجات ہو جاتی ہے۔

رمضان کے مخصوص اعمال

رمضان میں اگرچہ تمام نیکیاں اور ہر قسم کی عبادات کا اہتمام ہونا چاہئے اور ان اعمال وعبادات میں سے جن اعمال وعبادات کو رمضان مبارک کے ساتھ خصوصیت کا تعلق ہے، ان کا اہتمام والتزام بھی خصوصی طریقے پر ہونا چاہئے اور وہ چار اعمال ہیں:

(۱)صوم یعنی روزہ (۲)نماز تراویح (۳)آخری عشرہ کا اعتکاف (۴)تلاوت

لہٰذا تمام عبادات واعمال صالحہ میں اضافہ اوران کا اہتمام والتزام کرنا اور بالخصوص ان چار عبادات کا اہتمام کرنا رمضان کو صحیح طریقے پر گزارنے کے لئے ضروری ہے،اب ہم ان چار عبادات کا الگ سے ذکر کرتے ہیں۔

روزے کا بیان

روزے کی فرضیت واہمیت:

قرآن کریم میں فرمایا گیا:**یَـٰٓأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ**.(البقرہ:۱۸۳)

(اے ایمان والو!تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں،جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر بھی فرض کئے گئے تھے تا کہ تم متقی بن جاؤ)

اس آیت سے روزے کی فرضیت واہمیت صاف ظاہر ہے،فرضیت تو اللہ کے یہ فرمانے سے معلوم ہوئی کہ تم پر روزے لکھ دیئے گئے ہیں اوراہمیت کا پتہ اس طرح چلا کہ روزے کی فرضیت کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ تم میں تقویٰ پیدا ہوجائے اور ظاہر ہے کہ تقویٰ کی ہی بنیاد پر انسان اللہ کے نزدیک مکرم ومقدس بنتا ہے،جیسا کہ فرمایا گیا:’’اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ.‘‘(الحجرات:۱۳)

(اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ مکرم وہ ہے جو سب سے متقی ہو)

اور جو چیز کہ انسان میں تقویٰ کی صفت پیدا کرنے والی ہو،وہ اس لحاظ سے کہ تقویٰ کا سبب وباعث ہے کس قدر اہم ہوگی؟نیز اس کی اہمیت کا اندازہ اس طرح بھی ہوتا ہے کہ اکثر حضرات کے نزدیک صوم،اسلام کے ارکان میں سے زکوٰۃ کے بعد سب سے اہم عبادت ہے اور بعض علماء کے نزدیک نماز کے بعد سب سے زیادہ اہم روزہ ہے،اس کے بعد زکوٰۃ کا درجہ ہے اور امام محمدؒ نے اسی کے پیش نظر اپنی کتاب’’الجامع الصغیر‘‘اور’’الجامع الکبیر‘‘میں نماز کے بعد صوم کا بیان لکھا ہے۔(فتح القدیر:۱/۳۰۰،حاشیۃ الطحطاوی علی المراقی:۱/۴۱۹،البحر الرائق:۲/۲۸۶)

روزے کی فضیلت

اس اہمیت کی وجہ سے روزے کی بڑی فضیلت بھی وارد ہوئی ہے:

(۱)حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا کہ **’’مَنْ صَامَ رَمْضَانَ اِیْمَاناً وَّ اِحْتِسَاباً غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَ مَنْ قَامَ لَیْلَةَ الْقَدْرِ اِیْمَانًا وَّ اِحْتِسَاباً غُفِرَ لَهٗ مَا**

تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ“ (بخاری:۱۷۶۸، مسلم:۱۲۶۸، نسائی:۲۱۸۳، ابوداؤد:۱۱۶۵، احمد:۱۹۰۰)

(جوشخص ایمان کے ساتھ اور ثواب سمجھ کر رمضان کے روزے رکھتا ہے اس کے تمام گزشتہ گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اور جو لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور ثواب سمجھ کر عبادت کرتا ہے اس کے بھی تمام گزشتہ گناہ بخش دیئے جاتے ہیں)

روزے کی حقیقت اور قسمیں

روزہ کو عربی میں ”صوم“ کہا جاتا ہے اور ”صوم“ کے معنی ”امساک“ (رک جانے) کے ہیں اور شریعت میں صوم کی حقیقت یہ ہے کہ پورا دن کھانے، پینے اور بیوی سے مباشرت کرنے سے رک جائے۔ (التعریفات للجرجانی:۱۷۸، انیس الفقہاء:۱/۱۳۷)

علماء نے فرمایا ہے کہ روزے کی تین قسمیں ہیں: ایک عوام الناس کا روزہ، دوسرے خواص کا روزہ اور تیسرے اخص الخواص کا روزہ۔

روزے کی پہلی قسم

عوام کا روزہ یہ ہے کہ صرف کھانے پینے اور جماع کرنے سے اپنے آپ کو روک لیا جائے، باقی دیگر اللہ کی منع کردہ چیزوں سے باز نہ آئے۔ یہ سب سے کم درجے کا روزہ ہے۔ اس سے روزہ ادا تو ہو جاتا ہے مگر اس پر ان فضائل وبرکات کا ترتب نہیں ہوتا جن کا ذکر احادیث میں گزرا ہے، اسی لئے ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

”مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَدَعَ طَعَامُهٗ وَ شَرَابَهٗ“ (بخاری:۱۷۷۰، ترمذی:۶۴۱، ابوداؤد:۲۰۱۵)

(جوشخص جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑے اللہ کو کچھ حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے)

اور بعض روایات میں یہ اضافہ ہے کہ جو جہل اور جہل پر عمل کو نہ چھوڑے اس کے کھانے پینے کو چھوڑنے میں اللہ کی کچھ حاجت نہیں۔ (ابن ماجہ:۱۶۷۹، احمد:۹۴۶۳)

اس حدیث کے تحت علامہ ابن العرب مالکیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مقتضی یہ ہے کہ جو ان باتوں (یعنی جھوٹ وغیرہ) کا ارتکاب کرے، اس کے روزے پر ثواب نہ دیا جائے گا اور قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ روزے کی مشروعیت سے صرف بھوک و پیاس مقصود نہیں ہے بلکہ اس سے مقصود شہوتوں کو توڑنا اور نفس

امارہ کو نفس مطمئنہ کا مطیع بنانا ہے۔(فتح الباری:۴/۱۱۷)

الغرض صرف کھانا پینا چھوڑنے سے اگرچہ روزہ ادا ہو جاتا ہے اور ذمہ سے فرض ساقط ہو جاتا ہے مگر اس پر ثواب اور وہ فضائل مرتب نہیں ہوتے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں۔

(۲) روزہ کی دوسری قسم

دوسری قسم خواص کا روزہ ہے، وہ یہ کہ کھانے پینے اور جماع سے رکنے کے ساتھ ساتھ اپنے اعضاء، ہاتھ، پیر، زبان، آنکھ، کان وغیرہ کو بھی اللہ کی منع کردہ چیزوں سے محفوظ رکھا جائے، یعنی شریعت کے خلاف کوئی بات ان اعضاء سے صادر ہونے نہ دیا جائے۔

شریعت میں یہ روزہ مطلوب ہے، جیسا کہ اوپر کی حدیثوں سے معلوم ہوا۔ اور اوپر پیش کردہ اس حدیث میں اسی طرف رہنمائی کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ’’**مَنْ صَامَ رَمَضَانَ وَ عَرَفَ حُدُوْدَهٗ وَ تَحَفَّظَ مِمَّا كَانَ يَنْبَغِيْ لَهٗ اَنْ يَّتَحَفَّظَ فِيْهِ كُفِر مَا قَبْلَهٗ**‘‘.

(جس نے رمضان کا روزہ رکھا اور اس کے حدود کو جانا اور ان باتوں سے اپنے کو محفوظ رکھا جن سے بچنا مناسب ہے تو یہ روزہ اس کے گزشتہ گناہ کا کفارہ بنا دیا جاتا ہے)

اس سلسلہ میں ایک عبرتناک حدیث ملاحظہ کیجئے، وہ یہ کہ دو عورتوں نے روزہ رکھا اور پیاس کی شدت سے مرنے کے قریب ہو گئیں، ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے ان دونوں کو بلوایا اور جب وہ آئیں تو آپ نے ان کو ایک پیالے میں قے کرنے کے لئے فرمایا، ان عورتوں نے جب قے کیا تو اس میں خون اور پیپ اور کچا گوشت نکل آیا، اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’’**اِنَّ هَاتَيْنِ صَامَتَا عَمَّا اَحَلَّ اللّٰهُ وَ اَفْطَرَتَا عَلٰى مَا حَرَّمَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ عَلَيْهِمَا جَلَسَت اِحْدَاهُمَا اِلَى الْاُخْرٰى فَجَعَلَتَا تَأْكُلَانِ لُحُوْمَ النَّاسِ**‘‘ (مسند احمد:۲۳۶۵۳، مسند ابو یعلی:۳/۱۴۶، قلت: اسنادہ ضعیف)

(ان دو عورتوں نے ان چیزوں سے تو روزہ رکھا جن کو اللہ نے حلال کیا ہے اور ان چیزوں سے روزہ کو توڑ دیا جن کو اللہ نے حرام کیا ہے، ان میں سے ایک دوسری کے پاس بیٹھ کر لوگوں کے گوشت کھانے لگیں، یعنی غیبت کرنے لگیں)

الغرض اپنے اعضاء و جوارح کو ہر قسم کے گناہوں سے بچانے کی فکر کرتے رہنا اور روزہ کی حدود کا خیال رکھنا مطلوبہ روزہ کے لئے نہایت ضروری ہے۔

(۳) روزہ کی تیسری قسم

تیسری قسم کا روزہ اخص الخاص کا روزہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اوپر بیان کردہ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ اپنے دل کو بھی تمام برائیوں اور گندگیوں سے پاک وصاف کرلیا جائے، مثلاً حسد، بغض، کینہ، تکبر، ریاکاری وغیرہ امراض قلبی سے پاک ہوجائے۔

یہ روزہ بھی شرعاً مطلوب ہے۔ چنانچہ بعض حدیثوں میں یہ آیا ہے کہ یہ مہینہ صبر کا مہینہ ہے اور مواساۃ و ہمدردی وغم خواری کا مہینہ ہے۔ (اخرجہ ابن خزیمہ:۳/۱۹۱، والبیھقی فی شعب الایمان:۳/۲۰۵، عن سلمان الفارسی فی حدیث طویل)

اس میں اسی طرف اشارہ ہے کہ ایک دوسرے کے لئے دل صاف و پاک ہو، دل میں ہمدردی ہو اور صبر ہو جو کہ تمام برائیوں سے خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی ہوں، دور رہنے اور اپنے نفس کو ان سے روکنے کا نام ہے۔

حاصل یہ کہ پہلا روزہ ناقص ہے، دوسرا کامل اور تیسرا اکمل، ہم کو کوشش کرنا چاہئے کہ ہم اخص الخواص یا کم از کم خواص کے روزے کی طرح روزہ رکھیں، صرف پیاسے، بھوکے نہ رہیں، جیسے ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ **"رُبَّ صَائِمٍ لَیْسَ لَهُ مِنْ صِیَامِهِ اِلَّا الْجُوْعُ وَ رُبَّ قَائِمٍ لَیْسَ لَهُ مِنْ قِیَامِهِ اِلَّا السَّهْرُ"** (ابن ماجہ:۱۶۸۰، احمد)

(بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جنہیں سوائے بھوک کے کچھ حاصل نہیں اور بہت سے رات بھر نماز پڑھنے والے ہیں، جنہیں سوائے رات گزاری کے کچھ حاصل نہیں)

ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ **"رُبَّ صَائِمٍ حَظُّهُ مِنْ صِیَامِهِ الْجُوْعُ وَالْعَطْشُ وَ رُبَّ قَائِم حَظُّهُ مِنْ قِیَامِهِ السَّهرُ"** (احمد:۸۵۰۱)

(بہت سے روزہ دار ہیں جن کا نصیب وحصہ بھوک و پیاس ہے اور بہت سے رات بھر نماز پڑھنے والے ہیں جن کا حصہ رات گزاری ہے)

❀❀❀

رمضان المبارک میں

اکابر کے معمولات

مفتی محمد وقاص رفیع

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام اور کام سے اہل علم خوب واقف ہیں، آپ ہمارے ماضی قریب کے ایک تبحر عالم، ایک عظیم مجاہد اور ایک زبردست صاحب عمل بزرگ گزرے ہیں۔ آپ بذاتِ خود گوشہ نشینی اور گم نامی کو پسند کرتے تھے، اس لئے آپ کے ذاتی معمولات بالخصوص رمضان المبارک کے معمولات کی کوئی زیادہ تفصیل کہیں نہیں ملتی، تاہم شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے رمضان المبارک کے حوالے سے آپ کے یہ چند معمولات ذکر کئے ہیں کہ مشہور ہے کہ حضرت نے ۱۲۷۷ء کے سفر حجاز میں (اس) ماہِ مبارک میں قرآنِ پاک حفظ کیا تھا، روزانہ ایک پارہ یاد کر کے تراویح میں سنایا کرتے تھے، مگر حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے سوانح قاسمیؒ میں تحریر فرمایا کہ جمادی الثانیہ ۱۲۷۷ء میں حج کے لئے روانہ ہوئے، آکر ذی قعدہ میں مکہ مکرمہ پہنچے، بعد حج مدینہ شریف پہنچے اور ماہِ صفر میں مدینہ پاک سے مراجعت فرمائی، ربیع الاوّل کے اخیر میں بمبئی پہنچے، اور جمادی الثانیہ تک وطن پہنچے۔ جاتے ہوئے کراچی سے جہاز بادبانی میں سوار ہوئے، رمضان کا چاند دیکھ کر مولوی صاحب نے قرآن شریف یاد کیا تھا اور وہاں سنایا۔ بعد مکلاّ پہنچ کر حلوائے مسقط خرید فرما کر شیرینی ختم دوستوں کو تقسیم فرمائی۔

مولوی صاحب کا اس سے پہلے قرآن یاد کرنا کسی کو ظاہر نہ ہوا تھا، بعد ختم مولوی صاحب فرماتے تھے کہ فقط دو سال رمضان میں مَیں نے یاد کیا اور جب یاد کیا پاؤ سپارہ کی قدر یا کچھ اس سے زائد یاد کر لیا، پھر تو بہت کثرت سے پڑھتے۔ ایک بار یاد ہے کہ ستائیس پارے ایک رکعت میں پڑھے، اگر کوئی اقتداء کرتا رکعت کر کے یعنی سلام پھیر کر اس کو منع فرما دیتے اور تمام شب تنہا پڑھتے رہتے۔ (سوانح قاسمیؒ) مشہور قول

میں ایک سال اور حضرت کے ارشاد میں دو سال اور پاو پاو پارہ یاد کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے رمضان میں کچھ حصہ پاو پاو پارہ یاد کیا اور دوسرے رمضان میں سفر حج میں تھا ایک ایک پارہ پڑھ کر اس کی تکمیل فرمائی۔ (اکابر کا رمضان: ص ۲۷)

سید الطائفہ حضرت الحاج امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے رمضان کے معمولات حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ نے امداد المشتاق میں نقل کئے ہیں کہ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ تمہاری تعلیم کے واسطے کہتا ہوں، یہ فقیر عالم شباب میں اکثر راتوں کو نہیں سویا، خصوصاً رمضان شریف میں بعد مغرب دو لڑکے نابالغ حافظ یوسف ولد حافظ ضامن صاحب وحافظ حسین احمد میرا بھتیجا سوا سوا پارہ عشاء تک سناتے تھے۔ ان کے بعد ایک حافظ نصف شب تک۔ اس کے بعد تہجد کی نماز میں دو حافظ۔ غرض کہ تمام رات اسی میں گزر جاتی تھی۔ (امداد المشتاق)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ریاضت ومجاہدہ کی یہ حالت تھی کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا اور ترس کھایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس پیرانہ سالی میں جب آپ ستر سال کی عمر سے متجاوز ہو لئے تھے کثرتِ عبادت کا یہ عالم تھا کہ دن بھر کا روزہ اور بعد مغرب چھ کی جگہ بیس رکعت صلوٰۃ الاوّابین پڑھا کرتے تھے، جس میں تخمیناً دو پارے قرآنِ مجید سے کم کی تلاوت نہ ہوتی تھی، پھر اسی کے ساتھ رکوع سجدہ اتنا طویل کہ دیکھنے والے کو سہو کا گمان ہو۔ نماز سے فارغ ہو کر مکان تک جاتے اور کھانا کھانے کے لئے مکان پر ٹھہرنے کی مدت میں کئی پارے کلام مجید ختم کرتے تھے۔ پھر تھوڑی دیر بعد نمازِ عشاء اور صلوٰۃِ تراویح (جس میں گھنٹے سوا گھنٹے سے کم خرچ نہ ہوتا تھا) ادا فرماتے تھے۔

تراویح سے فارغ ہو کر ساڑھے دس، گیارہ بجے آرام فرماتے اور دو ڈھائی بجے ضرور ہی اُٹھ کھڑے ہو رہتے تھے، بلکہ بعض دفعہ خدام نے ایک ہی بجے آپ کو وضو کرتے پایا۔ اس وقت اُٹھ کر دو، دھائی، تین گھنٹے تک تہجد میں مشغول رہتی تھی۔ بعض دفعہ سحر کھانے کے لئے کسی خادم کو پانچ بجے جانے کا اتفاق ہوا تو آپ کو نماز ہی میں مشغول پایا۔

صلوٰۃِ فجر کے بعد آٹھ، ساڑھے آٹھ بجے تک وظائف، اوراد اور مراقبہ و ملاحظہ میں مصروفیت رہتی، پھر اشراق پڑھتے اور چند ساعات استراحت فرماتے، اتنے ڈاک آجاتی تو خطوط کے جوابات اور فتاویٰ لکھواتے اور چاشت کی نماز سے فارغ ہو کر قیلولہ فرماتے تھے۔ ظہر کے بعد حجرہ شریف بند ہو جاتا تھا اور تا عصر کلام اللہ کی تلاوت میں مشغول رہتے تھے، باوجودے کہ اس رمضان میں جس کا

مجاہدہ لکھا گیا ہے پیرانہ سالی ونقاہت کے ساتھ وجع الورک کی تکلیف شدید کا یہ عالم تھا کہ استنجا گاہ سے حجرہ شریف لانے میں حالاں کہ پندرہ سولہ قدم کا فاصلہ ہے مگر راہ میں بیٹھنے کی نوبت آتی تھی، اس حالت پرفرائض تو فرائض نوافل بھی کبھی بیٹھ کرنہیں پڑھے اوران میں گھنٹوں کھڑے رہنا، بارہا خدام نے عرض کیا کہ آج تراویح بیٹھ کرادا فرماویں تو مناسب ہے، مگر جب آپ کا جواب تھا یہی تھا کہ نہیں جی یہ کم ہمتی کی بات ہے اللہ رے ہمت! آخر افلا اکون عبدا شکورا کے قائل کی نیابت کوئی سہل نہ تھی جو اس ہمت کے بغیر حاصل ہو جاتی۔

یوں تو ماہِ رمضان المبارک میں آپ کی ہر عبادت میں بڑھوتری ہوتی تھی، مگر تلاوتِ کلام اللہ کا شغف خصوصیت کے ساتھ اس درجہ بڑھتا تھا کہ مکان تک آنے جانے میں کوئی بات نہ فرماتے تھے۔ نمازوں میں اور نمازوں کے بعد تخمیناً نصف ختم قرآنِ مجید آپ کا یومیہ معمول قرار پاتا تھا، جس شب کی صبح کو پہلا روزہ ہوتا تھا آپ حضارِ جلسہ سے فرمادیا کرتے تھے کہ آج سے کچہری برخاست !رمضان کو بھی آدمی ضائع کرے تو افسوس کی بات ہے، اس مجاہدہ پر غذا کی یہ حالت تھی کہ کامل رمضان بھر کی خوراک پانچ سیر اناج تک پہنچنی دشوار تھی۔ (تذکرۃ الرشید: ص:۶۵)

رمضان شریف میں آپ صبح کو خلوت خانہ سے دیر میں برآمد ہوتے۔ موسم سرما میں اکثر دس بجے تشریف لاتے نوافل اور قراتِ قرآن وسکوت ومراقبہ میں بہ نسبت دیگر ایام بہت زیادتی ہوتی، سونا اور استراحت نہایت قلیل، کلام بہت کم کرتے، بعد نمازِ مغرب ذرا دیر خلوت نشینی کا ذائقہ لے کر کھانا تناول فرماتے، تراویح کی بیس رکعات اوائل میں خود پڑھاتے تھے اور آخر میں صاحب زادہ مولوی حافظ حکیم محمد مسعود احمد صاحب کے پیچھے پڑھتے، بعد وتر دو رکعت طویل کبھی کھڑے ہو کر کبھی بیٹھ کر پڑھتے، دیر تک متوجہ بہ قبلہ بیٹھ کر پڑھتے رہتے، پھر ایک سجدہ تلاوت کر کے کھڑے ہوجاتے، غالباً اس دوران میں سورہ تبارک الذی اور سورہ سجدہ اور سورہ دخان پڑھتے تھے۔ (تذکرۃ الرشید: ص:۶۷)

❀❀❀

سونے یا چاندی کے زیورات پر زکوٰۃ واجب ہے

ڈاکٹر محمد نجیب قاسمی سنبھلی
ریاض، سعودی عرب

خیر القرون سے عصر حاضر تک کے جمہور علماء وفقہاء ومحدثین قرآن وحدیث کی روشنی میں عورتوں کے سونے یا چاندی کے استعمالی زیور پر وجوب زکوٰۃ کے قائل ہیں، اگر وہ زیور نصاب کے مساوی یا زائد ہو اور اس پر ایک سال بھی گزر گیا ہو، جس کے مختلف دلائل پیش کئے جاتے ہیں:

(۱) قرآن وسنت کے وہ عمومی حکم جن میں سونے یا چاندی پر بغیر کسی (استعمالی یا غیر استعمالی) شرط کے زکوٰۃ واجب ہونے کا ذکر ہے اور ان آیات واحادیث شریفہ میں زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے پر سخت ترین وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ متعدد آیات واحادیث میں یہ عموم ملتا ہے، اختصار کی وجہ سے صرف ایک آیت اور ایک حدیث پر اکتفاء کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: جو لوگ سونا یا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (یعنی زکوٰۃ نہیں نکالتے) سو آپ ان کو ایک بڑے دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے، جو اس روز واقع ہوگا کہ ان (سونے وچاندی) کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر ان سے لوگوں کی پیشانیوں اور ان کی کروٹوں اور ان کی پشتوں کو داغا جائے گا۔ اور یہ جتایا جائے گا کہ یہ وہ ہے جس کو تم اپنے واسطے جمع کر کے رکھتے تھے۔ سو اب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو۔ (سورۃ التوبہ)

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جس مال کی زکوٰۃ ادا کردی جائے وہ کنز تم (جمع کئے ہوئے) میں داخل نہیں ہے۔ (ابوداؤد، مسند احمد)

غرضیکہ جس سونے وچاندی کی زکوٰۃ ادا نہیں کی جاتی ہے، کل قیامت کے دن وہ سونا وچاندی جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں کو داغا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو تمام مال اور سونے وچاندی کے زیورات پر زکوٰۃ کی ادائیگی کرنے والا بنائے تاکہ اس دردناک عذاب سے ہماری حفاظت ہو جائے۔ آمین۔

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا : کوئی شخص جو سونے یا چاندی کا مالک ہو اور اس کا حق (یعنی زکوٰۃ) ادا نہ کرے تو کل قیامت کے دن اس سونے و چاندی کے پترے بنائے جائیں گے اور ان کو جہنم کی آگ میں ایسا تپایا جائے گا گویا کہ وہ خود آگ کے پترے ہیں۔ پھر اس سے اس شخص کا پہلو، پیشانی اور کمر داغ دی جائے گی اور قیامت کے پورے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی، بار بار اسی طرح تپا تپا کر داغ دئے جاتے رہیں گے، یہاں تک کہ ان کے لئے جنت یا جہنم کا فیصلہ ہو جائے۔

(مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فیمن لا یودی الزکوٰۃ)

اس آیت اور حدیث میں عمومی طور پر سونے یا چاندی پر زکوٰۃ کی عدم ادائیگی پر دردناک عذاب کی خبر دی گئی ہے خواہ وہ استعمالی زیور ہوں یا تجارتی سونا و چاندی۔ نیز قرآن کریم میں کسی ایک جگہ بھی استعمالی زیور کا استثنیٰ نہیں کیا گیا ہے۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک عورت نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس کے ساتھ اس کی بیٹی تھی جو دو سونے کے بھاری کنگن پہنے ہوئے تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے اس عورت سے کہا کہ کیا تم اس کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟ اس عورت نے کہا : نہیں۔ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا تم چاہتی ہو کہ اللہ تعالیٰ ان کی وجہ سے کل قیامت کے دن آگ کے کنگن تمہیں پہنائے۔ تو اس عورت نے وہ دونوں کنگن اتار کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے لئے پیش کر دئے۔ (ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ، باب الکنز ماھو وزکوٰۃ الحلی)

شارح مسلم امام نوویؒ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

(۳) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور میرے ہاتھ میں چھلا دیکھ کر مجھ سے کہا کہ اے عائشہ! یہ کیا ہے؟ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ میں نے آپ کے لئے زینت حاصل کرنے کی غرض سے بنوایا ہے۔ تو نبی اکرم ﷺ نے کہا : کیا تم اس کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟ میں نے کہا: نہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تو پھر یہ تمہیں جہنم میں لے جانے کے لئے کافی ہے۔ (ابوداؤد، دارقطنی)

محدثین کی ایک جماعت نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام خطابیؒ نے (معالم السنن) میں ذکر کیا ہے کہ غالب گمان یہ ہے کہ چھلا تنہا نصاب کو نہیں پہونچتا، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس چھلے کو دیگر زیورات میں شامل کیا جائے، نصاب کو پہونچنے پر زکوٰۃ کی ادائیگی کرنی ہوگی۔ امام سفیان ثوریؒ نے بھی یہی توجیہ ذکر کی ہے۔

(۴) حضرت اسماء بنت زید رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ میں اور میری خالہ نبی اکرم ﷺ کی

خدمت میں حاضر ہوئیں، ہم نے سونے کے کنگن پہن رکھے تھے۔ تو نبی اکرم ﷺ نے کہا: کیا تم اس کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟ ہم نے کہا: نہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا تم ڈرتی نہیں کہ کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کی وجہ سے آگ کے کنگن تمہیں پہنائے؟ لہٰذا ان کی زکوٰۃ ادا کرو۔ (مسند احمد)

محدثین کی ایک جماعت نے حدیث کو اس صحیح قرار دیا ہے۔ متعدد احادیث صحیحہ میں زیورات پر زکوٰۃ کے واجب ہونے کا ذکر ہے، یہاں طوالت سے بچنے کے لئے صرف تین احادیث ذکر کی گئی ہیں۔

استعمالی زیور میں زکوٰۃ واجب نہ قرار دینے حضرات عموماً دو دلیلیں پیش کرتی ہے۔

(۵) عقلی دلیل: اللہ تعالیٰ نے اسی مال میں زکوٰۃ کو واجب قرار دیا ہے جس میں بڑھوتری کی گنجائش ہو، جبکہ سونے اور چاندی کے زیورات میں بڑھوتری نہیں ہوتی۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ زیورات میں بھی بڑھوتری ہوتی ہے چنانچہ سونے کی قیمت کے ساتھ زیورات کی قیمت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

(۶) چند احادیث وآثار صحابہ: وہ سب کے سب ضعیف ہیں جیسا کہ محدثین نے دلائل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ ۸۰ ہجری میں پیدا ہوئے مشہور تابعی وفقیہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور علماء احناف کا قرآن وحدیث کی روشنی میں یہی موقف ہے کہ استعمالی زیور پر زکوٰۃ واجب ہے۔ ہندوپاک کے جمہور علماء کرام نے بھی قرآن وحدیث کی روشنی میں یہی تحریر کیا ہے کہ استعمالی زیورات میں نصاب کو پہنچنے پر زکوٰۃ واجب ہے۔ سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن بازؒ کی بھی قرآن وسنت کی روشنی میں یہی رائے ہے کہ استعمالی زیور پر زکوٰۃ واجب ہے۔

اصولی بات: موضوع بحث مسئلہ میں علماء کی ایک جماعت نے اختلاف ضرور کیا ہے، لیکن اس حقیقت کا کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی سونے یا چاندی پر زکوٰۃ کی ادائیگی نہ کرنے پر سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں کسی ایک جگہ بھی استعمالی یا تجارتی سونے میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔ نیز استعمالی زیور کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کرنے کے لئے کوئی غیر قابل نقد وجرح حدیث احادیث کے ذخیرہ میں نہیں ملتی ہے، بلکہ بعض احادیث صحیحہ استعمالی زیور پر زکوٰۃ واجب ہونے کی واضح طور پر رہنمائی کررہی ہیں۔ نیز استعمالی زیور پر زکوٰۃ کے واجب قرار دینے کے لئے اگر کوئی حدیث نہ بھی ہو تو قرآن کریم کے عمومی حکم کی روشنی میں ہمیں ہر طرح کے سونے وچاندی پر زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے خواہ اس کا تعلق استعمال سے ہو یا نہیں، تاکہ کل قیامت کے دن رسوائی، ذلت اور دردناک عذاب سے بچ سکیں۔ نیز استعمالی زیور پر زکوٰۃ کے واجب قرار دینے میں غریبوں، مسکینوں، یتیموں اور بیواوں کا فائدہ ہے تاکہ دولت چند گھروں

میں نہ سمٹے بلکہ ہم اپنے معاشرہ کو اس رقم سے بہتر بنانے میں مدد حاصل کریں۔

احتیاط : وہ مذکورہ بالا احادیث جن میں نبی اکرم ﷺ نے استعمالی زیور پر بھی وجوب زکوٰۃ کا حکم دیا ہے، ان کے صحیح ہونے پر محدثین کی ایک جماعت متفق ہے۔ لہذا احتیاط اسی میں ہے کہ ہم استعمالی زیور پر بھی زکوٰۃ کی ادائیگی کریں تاکہ زکوٰۃ کی ادائیگی نہ کرنے پر قرآن وحدیث میں جو سخت ترین وعیدیں وارد ہوئی ہیں ان سے ہماری حفاظت ہوسکے۔ نیز ہمارے مال میں پاکیزگی کے ساتھ اس میں نمو اور بڑھوتری اسی وقت پیدا ہوگی جب ہم مکمل زکوٰۃ کی ادائیگی کریں گے، کیونکہ زکوٰۃ کی مکمل ادائیگی نہ کرنے پر مال کی پاکیزگی اور بڑھوتری کا وعدہ نہیں ہے۔ نیز جو بعض اسلاف استعمالی زیور میں زکوٰۃ کے وجوب کے قائل نہیں تھے، ان کی زندگیوں کے احوال پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو اپنی ضروریات کے مقابلے میں دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں اپنی دنیا وآخرت کی کامیابی سمجھتے تھے اور اپنے مال کا ایک بڑا حصہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے تھے۔ تاریخی کتابیں ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہیں۔ اس وقت امت مسلمہ کا بڑا طبقہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے بھی تیار نہیں ہے چہ جائیکہ دیگر صدقات وخیرات وتعاون سے اپنے غریب بھائیوں کی مدد کرے، لہٰذا استعمالی زیور پر زکوٰۃ نکالنے میں ہی احتیاط ہے تاکہ ہم دنیا میں غریبوں، یتیموں اور بیواوں کی مدد کرکے کل قیامت کے دن نہ صرف عذاب سے بچ سکیں، بلکہ اجر عظیم کے بھی مستحق بنیں۔

چند وضاحتیں : اگر زیورات استعمال کے لئے نہیں ہیں بلکہ مستقبل میں کسی تنگ وقت میں کام آنے (مثلاً بیٹی کی شادی) کے لئے رکھے ہوئے ہیں یا سال سے زیادہ ہوگیا اور ان کا استعمال بھی نہیں ہوا، تو اس صورت میں سونے کے زیورات پر زکوٰۃ کے واجب ہونے پر تمام علماء کرام کا اتفاق ہے، یعنی امت مسلمہ کا دوسرا مکتب فکر بھی متفق ہے۔ ☆ زیورات کی زکوٰۃ میں زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت پرانے سونے کے بیچنے کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ یعنی آپ کے پاس جو سونا موجود ہے اگر اس کو مارکیٹ میں بیچیں تو وہ کتنے میں فروخت ہوگا اس قیمت کے اعتبار سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ ☆ Diamond پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے پر امت مسلمہ متفق ہے، کیونکہ شریعت اسلامیہ نے اس کو قیمتی پتھروں میں شمار کیا ہے۔ ہاں اگر یہ تجارت کی غرض کے لئے ہوں تو پھر نصاب کے برابر یا زیادہ ہونے کی صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ ☆ اگر کسی شخص کے پاس سونے یا چاندی کے علاوہ نقدی یا بینک بیلینس بھی ہے تو ان پر بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، البتہ دو بنیادی شرطیں ہیں: نصاب کے مساوی یا زائد ہو۔ ایک سال گزر گیا ہو۔

❀❀❀

مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ
اور علامہ کشمیریؒ سے ان کا تلمذ و تعلق

مولانا فضیل احمد ناصری
استاذ حدیث و نائب ناظم تعلیمات جامعہ ہٰذا

دارالعلوم دیوبند کی علمی و روحانی فضا نے پورے عالمِ انسانی پر جس طرح اپنے فیوض و برکات کی بارش کی، ہندوستان کی پوری علمی تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کرسکتی۔ علوم دینیہ اور فنونِ اسلامیہ کا کون سا گوشہ ایسا ہے جہاں اس کے انوار و آثار کا ظہور و استیلا نہیں ہے۔ چودہویں صدی میں اسی فضا میں اسلام کا وہ سپوت بھی تیار ہوا جس کے علم و فضل نے مشرق و مغرب اور عرب و عجم پر اپنی دھاک بٹھائی۔ یہ ہیں امیر المؤمنین فی الحدیث علامہ انور شاہ کشمیریؒ، جنہیں دنیا خاتم الفقہاء والمحدثین، رئیس الحکماء والمتکلمین اور امام العصر جیسے وقیع القاب سے یاد کرتی ہے۔ اخیر دور کی یہ وہ نابغۂ روزگار شخصیت ہیں جن کے علوم و فنون اور علو و کمالات پر اس عہد کے جبالِ علم و فن نے انتہائی وقیع الفاظ میں خراجِ تحسین اور گلدستۂ عقیدت پیش کیا۔ مسلک حنبلی کے مشہور محدّث علامہ علی یمنیؒ کا یہ تبصرہ سارے تبصروں پر بھاری ہے: **لو حلفت انه لا علم من ابی حنیفة لما حنثت.** اگر میں قسم کھالوں کہ علامہ کشمیریؒ امام ابوحنیفہ سے بھی بڑے عالم ہیں تو میں حانث نہیں ہوں گا۔ (نقش، دوام، ص ۲۱۴)

امام العصر علامہ کشمیریؒ دارالعلوم کے فقید المثال فاضل اور حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد ترین تلمیذ تھے، دارالعلوم کے استاذ بھی ہوئے اور پھر شیخ الحدیث وصدر المدرسین بھی۔ ۱۳۵۲ھ میں انہوں نے دنیا کو خیر باد کہا اور تصنیفات و تلامذہ کی شکل میں حسین اور لازوال یادگاریں چھوڑیں۔ تلامذہ میں ایک نام مولانا سعید احمد اکبرآبادی (ولادت ۱۹۰۸ء وفات ۱۹۸۵ء) کا ہے۔ یہ اصلاً مرادآباد کے نجھرایوں سے تعلق رکھتے تھے، نانیہال سیوہارہ تھا، آگرہ وطن ثانی رہا اور انتقال کراچی پاکستان میں ہوا۔ مشہور عالم دین مجاہد ملت حضرت

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ ان کے ماموں زاد بھائی تھے۔ ان کی رنگا رنگ شخصیت کا مختصر تعارف فخر المحد ثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب کشمیریؒ کے قلم سے سنئے:

''چھریرا بدن، نکلتا ہوا قد، نزاکت ونفاست سرمایۂ زندگی، رنگ پکا، داڑھی نہ عام مولویوں کی طرح دراز، نہ متنورین کے انداز میں فرنچ کٹ، سر پر انگریزی بال، بالوں کی ٹوپی، شیروانی لازمۂ پوشاک، غالبًا ضلع بجنور وطن، وطن ثانی آگرہ، اکبرآبادی نسبت وطن باقی وطنی نسبتوں پر غالب، مولانا متمول گھرانے سے تعلق رکھتے، والد ڈاکٹر پیشہ، پھر خدا جانے کیا بات پیش آئی کہ بجائے اسکول و کالج کے دینی درسگاہوں کا رخ کیا اور مختلف گھاٹوں کا پانی پیتے ہوئے دارالعلوم دیوبند آپہنچے۔ دورۂ حدیث علامہ کشمیریؒ سے پڑھا اور باختصاص شاگردوں میں شمار ہوئے۔'' (لالہ وگل، ص:۲۱۴)

مولانا اکبرآبادی کا حضرت کشمیریؒ سے تعلقات کا آغاز

مولانا اکبرآبادی امام العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے تلمیذ رشید تھے اور ان کے علوم کے زبردست مداح اور معتقد۔ تعلقات کا آغاز طالب علمی سے ہوا اور گزرتے وقت کے ساتھ ان پر شباب چڑھتا گیا۔ وہ اپنے استاذ کے عاشق زار تھے اور ان کی عظمت وعبقریت کے ثنا خواں۔ وہ ۱۹۲۵ء میں دیوبند آئے اور ۱۹۲۸ء میں یہیں سے فراغت پائی۔ دیوبند میں ان کا کل قیام چھ برسوں پر محیط رہا۔

حضرت کشمیریؒ کے درس میں

مولانا اکبرآبادیؒ کو شاہ صاحب کے جس وصف نے اولاً متاثر کیا، وہ ان کی تنوع سے لبریز تدریس تھی۔ علامہ کا درس جاننے والے جانتے ہیں کہ اپنی نوعیت کا عجیب وغریب اور محیر العقول درس ہوتا تھا، جس میں تفسیر وحدیث سمیت نحو، صرف، اشتقاق، بلاغت، علم کلام، اصولِ فقہ اور دوسرے اہم علوم عموماً زیر بحث رہتے تھے۔ پھر ان پر قدیم مفسرین، محدثین اور اعلام واساطین کے حوالے۔ یہ حیرت انگیز منظر طلبہ کے لئے تو تھا ہی تعجب انگیز، اربابِ علم وکمال کے لئے بھی خرقِ عادت ہی کی طرح تھا۔ مولانا اکبرآبادی نے ان کے درس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

''۱۹۲۶ء میں تمام علوم وفنون درسیہ سے فارغ ہونے کے بعد مجھ کو حضرت مولانا سید محمد انور شاہ مرحوم سے بسلسلۂ دورۂ حدیث بخاری اور ترمذی کا درس لینے کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کا درس کیا تھا، علوم وفنون کا بحر ذخار تھا جو شروع سے آخر تک پوری تیزی سے موجزن رہتا تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ

اپنی تقریر میں کثرت سے نامور مصنفین وائمہ اسلام کے حالات، ان کے علمی وعملی کارنامے، اجتہادات اور ان پر تنقید وغیرہ بیان فرماتے رہتے۔ خصوصاً علامہ ابن جوزی، حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی کتابوں کا شوق ہوا اور میں نے ان دونوں اماموں کی متعدد کتابیں پڑھیں۔ کچھ سمجھ میں آئیں اور کچھ نہیں آئیں۔ بہرحال پڑھیں سب۔ مولانا شبلی مرحوم کی تصنیفات نے جس سنجیدہ علمی ذوق کی طرح ڈالی تھی، حضرت شاہ صاحب کے درس نے اس میں پختگی پیدا کردی۔ درس کے علاوہ میں یوں بھی حضرت شاہ صاحب کی پرائیویٹ مجلس میں شریک ہوتا رہا تھا۔ آپ کی عام گفتگو بھی درس سے کم نہیں ہوتی تھی، میں اس سے استفادہ کرتا تھا۔'' (مشاہیر اہل قلم کی محسن کتابیں، ص:۲۷)

علامہ کشمیریؒ کی صحبت میں گزارے ماہ وسال زندگی کے بہترین لمحات

علامہ کشمیریؒ سے استفادے کا سلسلہ چلا تو یہی سلسلہ فراغت کے بعد انہیں ڈابھیل لے گیا، علامہ کشمیریؒ دارالعلوم سے علیحدہ ہوکر جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل تشریف لے گئے اور اپنی مسند تدریس یہیں سنبھالی، تو استاذ سے حد درجہ رسم وراہ نے انہیں بھی ڈابھیل پہنچا دیا، یہاں ان کا تقرر بطور مدرس ہوا اور تین سال گذارے، پھر ۱۹۳۱ء میں مدرسہ عالیہ فتح پوری، دہلی میں استاذ ہوگئے، ان کی تین سالہ کارگزاری سنئے:

''دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے یعنی فنون کی بھی تکمیل کر لینے کے فوراً بعد کم وبیش جو تین برس میں نے شیخ العرب والعجم حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ الکشمیریؒ اور ان کی جماعت کے ساتھ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، ضلع سورت (گجرات) میں گزارے ہیں، ان کو میں تعلیم وتربیت کے لحاظ سے اپنی زندگی کے بہترین سال شمار کرتا ہوں، کیوں کہ اگرچہ دیوبند کے شش سالہ قیام میں بھی درس و تدریس کے علاوہ اکابر اساتذہ کی معیت وصحبت کے فیض وشرف سے باریاب رہا، لیکن ڈابھیل کی بات ہی اور تھی۔'' (برہان، ص:۲، ج۸۴، شمارہ۷، جولائی ۱۹۸۰ء)

علامہ کشمیریؒ کی خصوصی توجہات کے سائے میں

اتنا ہی نہیں کہ بات استفادے پر رک گئی ہو، بلکہ علامہ کشمیریؒ کی خصوصی عنایات اور کرم فرمائیاں موسلادھار برستی رہیں، شب وروز کے معمولات کیا ہیں؟ کون سی کتابیں زیر مطالعہ ہیں؟ تدریس کیسی چل رہی ہے؟ یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات سے ان کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے، مولانا ہی سے سنئے:

''میں کم عمر تھا اور سب کا خورد، اس لئے ہر ایک محبت کرتا اور شفقت کی نظر رکھتا تھا۔ حضرت شاہ

صاحب کو توجہ خاص تھی، میرے درس کے لئے جو کتابیں تجویز ہوتیں ان کا انتخاب حضرت ہی کرتے اور پھر باقاعدہ اس کی نگرانی فرماتے کہ درس کیسا ہورہا ہے؟ ان کتابوں کی نشان دہی فرماتے جن کا مطالعہ مفید اور ضروری ہوتا۔ اگر کہیں مجھے اشکال پیش آتا اور میں دریافت کرتا تو فوراً جواب نہ دیتے بلکہ فرماتے: فلاں کتاب کے فلاں فلاں ابواب کو پڑھ لو اور پھر میرے پاس آؤ، اس کی تاکید ہمیشہ فرماتے کہ ثانوی درجہ کی کتابوں کے بجائے امہات کتب کا مطالعہ کروں۔'' (ایضاً ص:۳)

مولانا اکبر آبادیؒ اور ان کا رفع شک

مولانا اکبر آبادیؒ کتب بینی اور ورق گردانی کے بڑے رسیا تھے اور پچھلے دور کی بڑی بڑی کتابوں کو کنگھالنا، ان سے استفادہ کرنا اور اُن سے نتائج اخذ کرنا ان کی عادتِ ثانیہ تھی۔ بزرگوں کے حالات، ان کے کمالات، ان کی حیرت انگیز داستانیں پڑھتے تو انہیں لگتا کہ جو کچھ ہے، محض مبالغہ ہے، اس کی کوئی زمینی حقیقت نہیں، قلم کاروں نے خالص سخن سازی اور لفاظی کے علاوہ کچھ نہیں کیا ہے۔ لیکن ان کی یہ بدگمانی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی اور بہت جلد انہیں اپنے اس غلط خیال سے تائب ہونا پڑا۔ وہ خود ہی لکھتے ہیں:

''خود میرا اپنا حال یہ تھا کہ علمائے سلف کے شوقِ علم، وسعت مطالعہ، قوت وحفظ، ذہانت، غیر معمولی وسعت علم وعمیق نظر وغیرہ، علمی وذہنی کمالات سے متعلق ایک دو نہیں سیکڑوں حیرت انگیز واقعات پڑھے تھے، میں ان کو پڑھتا تھا اور دل میں خیال کرتا تھا کہ مورخین نے اپنی عام عادت کے مطابق رائی کا پہاڑ بنا کر پیش کردیا ہے، ورنہ ایک انسان میں بیک وقت اتنے کمالات کیوں کر جمع ہوسکتے ہیں، مدتوں دماغ پر یہی خیال مسلط رہا، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کو بہت قریب سے دیکھا اور حضرت موصوف کی صحبت میں بیٹھ کر سمندر سے کچھ قطرے حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی تو اب معاً وہ پہلا خیال بدلا اور یقین ہوگیا کہ جب عالم اسلامی کے انتہائی دور زوال میں بھی دیوبند نامی ایک قصبہ کے افق سے ایک ایسی شخصیت بلند ہوسکتی ہے جو حفظ حدیث میں حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ عینی وقسطلانی، کتب قدیمہ کے علم وتبحر میں حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم، علم معانی و بیان میں سعد الدین تفتازانی اور فخر خوارزم جار اللہ زمخشری، منطق و فلسفہ میں ملا محبّ اللہ بہاری اور صدر الدین شیرازی، عربی میں حافظ اور بدیع الزماں ہمدانی کا اور فارسی شعرو سخن میں خاقانی وانوری کا ہم پایہ اور حریف وہمسر ہو تو پھر یہ کیوں کر مستبعد اور عقلاً محال ہوسکتا ہے کہ اسلام کے اور مسلمانوں کے دورِ شباب وترقی میں ایسے علمائے اعلام پیدا ہوئے ہوں جن کی نظیر مادر گیتی کے بطن

سے آج تک پیدا نہ ہوئی، گویا حضرت شاہ صاحب کو دیکھ کر اپنے علمائے سلف کی عظمت کا صحیح احساس پیدا ہوا اور پہلی مرتبہ یہ محسوس ہوا کہ اتنے ائمہ سلف کی نسبت جو واقعات تاریخ کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں وہ مبالغہ پردازی نہیں، بلکہ واقعات کا اصل اور بے کم وکاست بیان ہے: جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم ☆ میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا'' (تصویرانور،ص۳۳۶)

اس سے ملتا جلتا تاثر وہ ہے جو الکشمیریؒ کی وفات کے بعد ڈابھیل کے تعزیتی اجلاس میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی زبان مبارک سے ادا ہوا تھا:

''عام طور پر دنیا آپ کو بے نظیر، قوی الحفظ اور وسیع العلم فاضل کی حیثیت سے جانتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ آپ کا تعارف ناقص ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی شخصیت میں علماء متقدمین کے کمالات اس طرح جمع ہوگئے تھے کہ کمالاتِ انوری کا ہر پہلو فخر روزگار شخصیتوں کا مکمل عکس نظر آتا ہے، اس لئے اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ اے شبیر! تم نے ابن حجر عسقلانی کو دیکھا ہے؟ یا ابن دقیق العید سے تمہاری ملاقات ہوئی یا تم کو سلطان العلماء عزالدین بن عبدالسلام کی زیارت کی سعادت نصیب ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ان شخصیتوں سے نیاز کا موقع ملا، زمانہ کی گردشوں کا فرق ہے، ورنہ حضرت شاہ صاحب مرحوم اگر قدیم صدیوں میں پیدا ہوئے ہوتے تو کتب سیر وسوانح میں ان کا ذکر انہیں مذکورہ اشخاص کے پہلو بہ پہلو کیا جاتا۔ تشبیہ واستعارہ کی زبان میں حضرت مرحوم کی زیارت متقدمین علماء کی زیارت اور ان سے شرف ہم کلامی ہے، اس لئے میرے نزدیک ان کی وفات ابن حجر کا سانحہ، ابن دقیق العید کی رحلت اور سلطان العلماء کا دنیا سے اٹھ جانا ہے۔ ملخصاً'' (نقش دوام،ص:٦٧)

مولانا اکبرآبادی کا ڈابھیل سے استعفیٰ اور حضرت کشمیریؒ کا اظہارِ افسوس

قلتِ تنخواہ نے انہیں جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل میں زیادہ ٹکنے نہ دیا۔ تین ہی سال گذرے تھے کہ طبیعت اُچاٹ ہوگئی اور استعفیٰ دے کر جامعہ سے چلے آئے۔ اس کے بعد جو ہوا فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیریؒ کی زبانی سنئے:

''مدارس میں مشاہرے قلیل، اضافۂ تنخواہ کی درخواست کے مسترد ہونے پر انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی ٹھانی، ڈابھیل میں وداعی ملاقات علامہ کشمیریؒ سے ہوئی تو فرمایا: کہ مولوی صاحب! آپ نے ہم سے تنخواہ کے اضافہ کے لئے گفتگو نہیں کی ورنہ میں اس مہم میں آپ کا معاون ہوتا۔ اچھا جایئے خدا تعالیٰ

آپ کو ایم-اے کرے۔ گفتۂ او گفتۂ اللہ بود، ایم-اے پر گاڑی رک گئی۔'' (لالہ وگل، ص: ۲۱۴)

علامہ کشمیریؒ پر پی-ایچ-ڈی کی نگرانی

ڈابھیل سے نکلے تو ۱۹۳۱ء میں مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں مسندِ تدریس سنبھالی، وہاں بھی ان کا قیام زیادہ نہ رہ سکا۔ ۱۹۳۴ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بی اے پرائیویٹ مکمل کیا اور ۱۹۳۶ء میں سینٹ اسٹیفن کالج دہلی یونیورسٹی سے ایم اے عربی کی تکمیل کی، پھر یہیں سے ایم اے انگریزی بھی مکمل کیا، پھر بقول شاہ صاحب: گاڑی یہیں پر رک گئی۔

مولانا اکبرآبادی کا عصری علوم کی تحصیل کا سفر تمام ہوا تو اس کے چند برسوں کے بعد ۱۹۴۰ء میں سینٹ اسٹیفن کالج کے استاذ عربی مقرر ہوئے، پھر جب دہلی یونیورسٹی میں عربی فارسی اور اردو کے مشترکہ شعبہ کی بنا پڑی تو مولانا کو اس کا صدر بنایا گیا، یہاں ان کی تدریس چھ برس تک جاری رہی، پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق مرحوم نے اسی دور میں اُن سے پڑھا تھا۔ پھر اکبرآبادی مرحوم مختلف اداروں میں اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے نوبت بایں جا رسید کہ ۱۹۵۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے سربراہ ہوگئے۔ علی گڑھ تشریف فرما ہوئے تو اپنی زیرِنگرانی سب سے پہلا مقالہ برائے پی-ایچ-ڈی علامہ کشمیریؒ پر ہی تیار کرایا، جو استاذ سے ان کے عشق اور انتہائی قلبی لگاؤ کی طرف راست غمازی کرتا ہے۔

بارگاہِ کشمیریؒ سے مولانا اکبرآبادی کو حسنِ نگارش کی سند

علامہ کشمیریؒ فضل وکمال کے جس انفرادی مقام پر فائز تھے ان کی نظر میں کسی کا جچ جانا بہت مشکل تھا، بڑے بڑے اربابِ جبہ ودستار اور اصحابِ تصانیف بھی ان کی زبان پر آتے تو اعترافِ کمال کے ساتھ ان کی فروگذاشتوں پر روشنی ڈالنا نہیں بھولتے تھے۔ معاصرین میں سے تو ان کی توثیق کردہ شخصیات خال خال ہی ملیں گی۔ یہ مولانا اکبرآبادی کا کمال اور لوح وقلم میں ان کی پختگی وسربلندی کی دین ہے کہ علامہ کشمیریؒ جیسا نقاد بھی انہیں داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

اسی برہان میں ہے کہ: ''اس زمانہ میں دیوبند سے ایک ہفتہ وار اخبار ''مہاجر'' کے نام سے نکلتا تھا، یہ اخبار ہماری جماعت کا ترجمان تھا اور میں اس کا مستقل مضمون نگار تھا، اس کی ہر اشاعت میں نام کے ساتھ یا بغیر نام کے میرا ایک آدھ مضمون ضرور ہوتا تھا۔ میرے یہ مضامین حضرت شاہ صاحبؒ کی نظر سے گزرتے تھے۔ ان میں اگر کوئی اچھی بات ہوتی تو تحسین اور کوئی سقم ہوتا تو تنبیہ فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ

لاہور سے آنے کے بعد میں نے ''مقبرۂ نور جہاں پر ایک لمحۂ اشک'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، جو خالص ادبی تھا، اس میں میں نے اس کی تصویر کشی کی تھی کہ نور جہاں کون تھی اور کس صاحبِ اورنگ وحشم شہنشاہ کی چہیتی رفیقۂ حیات تھی؟ اور اس کے بعد مقبرہ جس خراب وخستہ حالت اور عالم کس مپرسی میں پڑا تھا، اس کی منظر نگاری کی تھی، حضرت الاستاذ نے ''مہاجر'' میں یہ مضمون پڑھا تو آب دیدہ ہو گئے، فوراً مجھ کو کمرہ سے بلا کر داد دی اور فرمانے لگے: ماشاء اللہ قلم میں بڑی توانائی ہے۔'' (ص:۳۰)

اردو علامہ کشمیریؒ کی نظر میں

بات مولانا اکبرآبادی کی مضمون نگاری اور اس پر حضرت کشمیریؒ کی توثیق کی آ گئی تو لگے ہاتھوں یہ بھی سن ہی لیجئے کہ امام العصر علامہ کشمیریؒ نے اپنی تدریس اور تصنیف کے لئے اگر چہ اردو کو ذریعۂ اظہار نہیں بنایا مگر اس کی اہمیت کے دل دادہ ضرور رہے۔ اس زبان میں ان کی کئی اہم نظمیں بھی ہیں، جن سے اردو پر ان کی مالکانہ گرفت اور مہارتِ تامہ کا پتہ چلتا ہے، تاہم ایک دور وہ بھی گزرا ہے کہ کشمیریؒ اس سے ہمیشہ بدگمان رہے اور یہ خیال جمائے رہے کہ اردو کا دامن علوم اسلامیہ سے خالی ہے، مگر پھر ایک واقعہ کے بعد انہیں یہ رائے بدلنی پڑی۔ فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

''یہ بھی سنئے کہ بیان القرآن یعنی قرآن حکیم کی تفسیر جسے مولانا تھانویؒ کے علم ریز قلم نے تیار کیا جب اس کا مطبوعہ نسخہ دیوبند پہنچا اور شاہ صاحبؒ نے بالاستیعاب اس کا مطالعہ کیا تو طلبہ سے درس بخاری میں ارشاد فرمایا کہ: ''میں نے اپنے ذوقِ علمی کو محفوظ رکھنے کے لئے اردو سے مطالعہ میں ہمیشہ پرہیز کیا تا آں کہ اپنی نجی مراسلت کی زبان بھی عربی اور فارسی ہی رکھی اور ہمیشہ یہ سمجھتا رہا کہ اردو کا دامن علم وتحقیق سے خالی ہے، لیکن مولانا تھانویؒ کی تفسیر کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے اپنی رائے میں ترمیم کرنا پڑی اور اب سمجھتا ہوں کہ اردو بھی بلند پایہ علمی تحقیقات سے بہرہ ور ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ''بیان القرآن'' جیسی چست تفسیر دیکھنے میں نہیں آئی۔'' (نقش دوام، ص:۲۸۸)

اردو زبان میں کمال حاصل کریں

پھر تو علامہ کشمیریؒ کی رائے ایسی بدلی کہ باقاعدہ اس کی تحصیل کی ترغیب دینے لگے اور اپنے تلامذہ کو سخت تاکید فرمانے لگے کہ اردو سیکھیں اور اتنی سیکھیں کہ درجۂ کمال تک پہنچ جائیں۔ اردو سے بے اعتنائی علماء پر داغ ہے، اس داغ کو دھونا بہت ضروری ہے۔

اس سلسلے کی مزید تفصیل مولانا اکبرآبادی کے قلم سے سنئے:

''اس موقع پر بے ساختہ ہم کو اپنے استاذ حضرت العلامہ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ کی یاد آرہی ہے، جو علوم وفنون کے بحرِ ذخار ہونے کے ساتھ اپنے پہلو میں بدرجۂ غایت حساس و بیدار دل رکھتے تھے اور مغربی علوم کی حشر سامانیوں اور تہذیب وتمدن جدید کی بلاخیزیوں کا تذکرہ دردناک لہجہ میں کرکے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانہ میں اگر تم کو علم ومذہب کی خدمت ہندوستان میں رہ کر کرنی چاہتے ہو تو اردو تحریر میں کمال پیدا کرو اور انشاء کے جدید دور میں مہارت استعمال کرو۔ حضرت اقدس نے اپنی تصنیف وتالیف کے لئے ہمیشہ عربی زبان کو اختیار فرمایا، لیکن زمانہ کے حالات کو بدلتا ہوا دیکھ کر اپنے خدام کو تاکید کرتے تھے کہ اردو زبان میں کمال حاصل کریں اور علماء پر بالعموم اردو زبان میں کوتاہ قلم ہونے کا جو الزام عائد کیا جاتا ہے اس کو حرفِ غلط کی طرح مٹا ڈالیں۔ ہم اس وقت ایک خارزار میں قدم رکھ رہے ہیں لیکن ہمیں قوی امید ہے کہ اولاً خدائے قدوس کے فضل وکرم اور ثانیاً حضرت استاذ کا فیضانِ روح ہمارے لئے خضرِ راہ ثابت ہوگا۔ ہمارے تمام ولولے، امنگیں، ارادے اور حوصلے اصل یہ ہے کہ یہ سب کے سب حضرت استاذ کے سرچشمۂ فیض ہی کا ثمرہ اور انہیں کی پیدا کی ہوئی روح کا نتیجہ ہیں۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ'' (برہان، جولائی ۱۹۳۰ء)

علامہ کشمیریؒ اور ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے درمیان بحیثیت ترجمان

اردو کی بات آگئی تو ڈاکٹر محمد اقبال کا ذکر یہاں ہرگز بے محل نہ ہوگا، کیوں کہ وہ اس زبان کے سرآمد اور قدآور شخصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی اردو تصنیفات نے اہل علم وارباب دانش کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ان کے اشعار نے تو اسلام کی وہ ترجمانی کی ہے کہ ان سے پہلے ایسی ترجمانی بزبانِ اردو کسی کے نصیب میں نہیں آئی۔ ڈاکٹر مرحوم اپنے تمام تر کمالات اور اردو زبان وادب کی جولان گاہ میں اپنی کامرانیوں کے جھنڈے گاڑنے کے باوجود کئی مقامات ایسے ہیں جہاں انہیں ٹھوکر لگی اور ان کا عقیدہ فساد کی زد میں آیا۔ ایسے نازک موقع پر علامہ کشمیریؒ نے انہیں صراطِ مستقیم دکھایا اور وہ گمراہی کے راستے پر دیر تک چلنے سے بال بال بچ گئے۔ اپنے اپنے میدان کی ان دو شخصیات کے درمیان جنہیں سفیر اور قاصد کی خدمت انجام دینے کی سعادت میسر آئی ان میں ایک نام حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ کا بھی ہے۔ ایک قصہ انہی کی زبانی سن لیجئے:

''یہاں شاید اس واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ حضرت الاستاذ کا ایک منظوم رسالہ حدوث عالم کی بحث پر ہے، یہ رسالہ حجم میں تو بہت مختصر ہی ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ اس مسئلہ (حدوث عالم) پر سارے قدیم وجدید

فلسفہ کا عطر اور اس پر تنقید ہے اور اس بنا پر جب تک کوئی شخص فلسفہ کا اچھا اور مبصر عالم نہ ہو وہ اس رسالہ سے پورے طور پر نفع حاصل نہیں کرسکتا، یہ رسالہ چھپ کر آیا تو اس کا ایک نسخہ حضرت الاستاذ نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے پاس بھی تحفۂ ارسال فرمایا، ڈاکٹر صاحب جس ذوق اور جس استعداد کے بزرگ تھے اس کے اعتبار سے ان کے لئے کوئی تحفہ اس چندورقی سے زیادہ قیمتی نہیں ہوسکتا تھا، بڑے خوش ہوئے اور پورا رسالہ بڑی توجہ اور غور وفکر کے ساتھ پڑھا، میں اس زمانہ میں بسلسلۂ طالب علمی لاہور میں مقیم تھا اور گاہے گاہے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر ان کی علمی وادبی مجلس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو معلوم تھا کہ مجھ کو حضرت شاہ صاحب کے ادنیٰ درجہ کے تلامذہ میں سے ہی ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے، بلکہ اس بارگاہ علم وفضل میں شخصی تقرب واختصاص کا مرتبہ بھی میسر رہے، اس بنا پر میرے ساتھ کرم وشفقت بزرگانہ کا معاملہ کرتے تھے اور جب کبھی حاضر ہوتا گھنٹوں بڑی بے تکلف اور سادگی کے ساتھ مختلف اسلامی مسائل پر گفتگو فرماتے تھے، اسی قسم کی ایک صحبت میں ایک مرتبہ فرمایا کہ میں تو مولانا انور شاہ صاحب کا رسالہ پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ رات دن قال اللہ اور قال الرسول سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں بھی ان کو اس درجہ درک وبصیرت اور اس کے مسائل پر اس قدر گہری نگاہ ہے کہ حدوث عالم پر اس رسالہ میں انہوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے، حق یہ ہے کہ آج یورپ کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی اس مسئلہ پر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا، اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے وہ رسالہ میرے حوالے کیا اور فرمایا کہ اس میں چار شعر ایسے ہیں جن کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا، میں نے ان پر نشان لگا دیا ہے، آپ اب دیوبند جائیں تو یہ نسخہ ساتھ لیتے جائیں اور شاہ صاحب سے ان اشعار کا مطلب دریافت کرتے آئیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کی تعمیل کی، دیوبند آکر وہ رسالہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کرکے ڈاکٹر صاحب کا پیغام پہنچایا، لیکن حضرت الاستاذ نے مجھ کو ان اشعار کا مطلب سمجھانے کے بجائے یہی مناسب خیال فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب کو فارسی میں ایک طویل خط لکھیں اور اسی میں ان اشعار کا مطلب بھی تحریر فرمادیں۔ یہ خط میں ہی دستی لے کر لاہور آیا اور ڈاکٹر صاحب کو پہنچادیا۔'' (تصویر انور، ص: ۳۳۸،۳۹)

مولانا اکبرآبادیؒ کے ساتھ علامہ کشمیریؒ کا بے تکلفانہ انداز

مولانا اکبرآبادی کو حضرت کشمیریؒ سے جو گہرا تعلق اور دیرینہ ربط وارتباط تھا اس کی ایک طویل داستان ہے، وہ اپنے استاذ کا ذکر جمیل جب بھی موقع آئے کرنے سے نہیں چوکتے۔ علامہ کشمیریؒ اپنے اس شاگرد

سے کتنا لگاؤ رکھتے تھے اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ان کے ساتھ کبھی کبھار مزاح بھی کرلیا کرتے تھے۔اسی تصویر انور میں مولانا اکبرآبادیؒ کا واقعہ خود ان کے قلم سے یوں ہے:

''ایک واقعہ لکھتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ حضرت الاستاذ کو مزاح کے ساتھ ساتھ چھوٹوں کی دل جوئی اوران کی دلدہی کا کس قدر خیال رہتا تھا۔اوپر گذر چکا ہے کہ حضرت الاستاذ میری شادی میں شریک ہوئے اور حضرت نے میرا نکاح پڑھا تھا۔ یہ مہینہ مئی کا تھا، جو آگرہ کے لئے بہت ہی شدید اور انتہائی سخت موسم ہے۔ بارات کو اعتماد پورہ جو آگرہ سے تین چار اسٹیشنوں کے فاصلہ پر ہے، وہاں جانا تھا، ریل کے اوقات کی مجبوری کی وجہ سے دوپہر کو تقریباً دوڈھائی بجے کے قریب ہم لوگ آگرہ سے روانہ ہوئے اور ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد اعتماد پور کے اسٹیشن پر پہنچ گئے، مگر منزل ابھی دو میل دور تھی، اسٹیشن سے قیام گاہ تک جانے کے لئے اس نواح کی مخصوص اور سخت تکلیف دہ سواری یعنی یکہ میں بیٹھنا تھا، پھر اس پر لطف یہ کہ راستہ نہایت ناہموار، جگہ جگہ گڈھے اور نشیب وفراز وہ کہ الامان! گرمی شباب پر۔نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قافلہ یکوں پر سوار ہوکر اسٹیشن سے شہر کی جانب روانہ ہوا تو راستہ کی ناہمواری اور گڈھوں کی فراوانی کی وجہ کے باعث برا حال ہوگیا۔حضرت شاہ صاحب ٹھہرے ایک نہایت ہی لطیف اور نازک مزاج بزرگ تھوڑی دیر چلنے کے بعد ہی یکہ کو رکوایا اور پاپیادہ ہوگئے، چلچلاتی دھوپ پڑ رہی ہے اور لو چل رہی ہے، چاروں طرف سے مٹی کے تودے ہیں کہ فضا میں گشت لگاتے پھر رہے ہیں اور اسی عالم میں حضرت شاہ صاحب منھ اور کانوں کو رومال میں لپیٹے ہوئے **حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل** پڑھتے ہوئے قدم بڑھائے اعتماد پور کی آبادی کی طرف چلے جارہے ہیں۔آخر خدا خدا کرکے مقام آیا۔ ایک بڑے مکان میں انتظام تھا وہاں ہم لوگوں کو پہنچادیا گیا۔ یہاں لوگ پہلے سے موجود تھے، کوئی پنکھا لے کر دوڑا، اور کوئی پانی سے بھرا لوٹا لے کر آیا کہ سخت گرمی میں چل کر آئے ہیں۔ ذرا منھ ہاتھ دھو کر ٹھنڈے ہو لیجئے۔حضرت شاہ صاحب کو صدر مجلس میں ایک قالین پر بٹھادیا گیا اور دو تین آدمی بڑے بڑے پنکھے لے کر جھلنے کھڑے ہوگئے، جب ذرا پسینہ خشک ہوگیا اور دم میں دم آگیا تو دودھ کے شربت کا ایک بھرا ہوا گلاس میں خود لے کر حضرت الاستاذ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں آنے کو تو آگیا، ورنہ حق یہ ہے کہ شرم کے بارے نگاہ نہیں اٹھتی تھی کہ میری وجہ سے مولانا شبیر احمد صاحب اور دوسرے حضرات کو عموماً اور حضرت الاستاذ کو خصوصاً کس قدر شدید تکلیف پہنچی ہے۔اسی قسم کی خیالات اور احساس ندامت وشرمندگی تھا جن سے میں اس وقت دوچار ہورہا تھا۔اسی عالم میں دودھ کے شربت کا گلاس حضرت الاستاذ کی طرف بڑھایا۔

حضرت میرے چہرے بشرے سے سمجھ گئے، گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا اور خوش مزاجی کے ساتھ فرمایا:

''الا یا ایھا الساقی اَدِرْ کاساً و ناولھا''

پھر ایک دو گھونٹ لینے کے بعد میری طرف دیکھ کر ذرا تبسم فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: اور مولوی صاحب: ''کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا''

خانوادۂ انوری سے اٹوٹ لگاؤ

علامہ کشمیریؒ کے انتقال کے بعد بھی خانوادۂ انوری سے ان کا رشتہ منقطع نہ ہوا بلکہ موقع بہ موقع فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیریؒ سے مکاتبت رکھتے اور بوقت ضرورت ان کی رہنمائی بھی فرماتے تھے۔ جب تک حضرت علامہ کشمیریؒ کی اہلیہ بقید حیات رہیں ان کی خیر خیریت بھی لیتے رہتے۔ جب ۱۹۶۷ء میں ان کا انتقال ہوا تو انہوں نے اپنے رسالہ ''برہان'' میں ایک مختصر خبری نوٹ لکھا:

''حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ الکشمیری کے ہزاروں تلامذہ اور ارادت مندوں کو جو برصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ معلوم کرکے بڑا املال ہوگا کہ حضرت موصوف کی اہلیہ محترمہ جنہیں ہم سب ''اماں جی'' کہا کرتے تھے جون کے آخری ہفتے میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر اس خاکدانِ عالم سے رخصت ہوگئیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحومہ بڑی خوبیوں اور اعلیٰ صفات وکمال کی خاتون تھیں۔ حضرت شاہ صاحب ایسے شوہر کی وفات کے بعد انہوں نے زندگی میں جس صبر ورضا واستقلال وتوکل کے ساتھ بسر کی ہے وہ انہیں کا حصہ تھی۔ کئی برس سے کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا تھیں۔ سعادت منداولاد نے بڑے سے بڑے علاج معالجہ میں کوئی کسر اٹھا کے نہیں رکھی لیکن وہ کینسر ہی کیا جس سے مریض جاں بر ہوجائے۔ اس مرض میں مرحومہ نے جو غیر معمولی تکالیف برداشت کی ہیں وہ یقیناً ان کے لئے درجۂ شہادت کی ضامن ہیں۔ اپنی اولاد معنوی کے ساتھ وہی تعلق رکھتی تھیں جو خود حضرت الاستاذ کو تھا۔ ان کا نفس وجود ہم لوگو کے لئے سرمایۂ خیر وبرکت تھا۔ افسوس اب یہ بھی ختم ہوا۔ اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور صدیقین اور شہداء کا مقام عطا ہو۔ آمین''

خلاصۂ کلام

حضرت مولانا اکبرآبادیؒ کا حضرت علامہ کشمیریؒ سے تعلقات ایک وسیع باب ہے، جو کئی دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ علامہ کشمیریؒ پر ان کے مضامین اور ان کی نگارشات اتنے ہیں بلاشبہ سوانح کشمیریؒ کا انہیں ثمن تو کہا ہی جاسکتا ہے۔ بہت سارے واقعات وروایات اور بہت سے اوصاف وکمالات ان ہی کی زبانی الامام کشمیریؒ کے حالات میں قلم بند ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں بزرگوں کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

❀❀❀

جامعہ کی سرگرمیاں

مولانا فضیل احمد ناصری
استاذ حدیث وناظم تعلیمات جامعہ ہٰذا

سالانہ امتحان کا انعقاد

اختتام ماہِ رجب پر جامعہ میں اسباق بند ہوگئے اور اس کے ساتھ ہی طلبہ سالانہ امتحان کی تیاریوں میں لگ گئے۔۲/شعبان کو ضمنی امتحان ہوا، جس میں ششماہی میں ناکام طلبہ نے شرکت کی۔ بعدازاں سالانہ امتحانات کا سلسلہ شروع ہوا۔

یہ امتحان ۴/شعبان تا ۱۶/شعبان ۱۴۴۰ھ منعقد ہوا۔ ناظمِ امتحان محترم جناب زعیم عابد صاحب، جب کہ محترم جناب مولانا مفتی عبید انور شاہ صاحب ان کے معاون ہیں۔

جامعہ کے ششماہی اور سالانہ امتحانات نہایت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان کی اسی اہمیت کے پیش نظر ممتحنین باہر سے مدعو کئے جاتے ہیں جو ہمہ پہلو جائزہ لے کر طلبہ کی تیاریوں کی کیفیات اور ان پر اپنے تاثرات اور مشوروں سے بھی نوازتے ہیں۔

انعقاد پذیر سالانہ امتحان کے لئے بھی دارالعلوم، دارالعلوم وقف دیوبند سمیت متعدد مستند اداروں کے مؤقر اساتذہ کو بحیثیت ممتحن مدعو کیا گیا ہے۔ یہ حضرات سوال نامے تحریر فرما کر جوابات کی کاپیاں بھی جانچیں گے اور اپنے تاثرات بھی قلم بند فرمائیں گے۔

تقریری امتحان کے لئے حضرات ممتحنین اپنے وقت مقررہ پر جامعہ تشریف لائیں گے۔ سالانہ امتحان طلبہ کی ترقی وتنزلی کا دارومدار ہے۔ جامعہ کے اصول کے مطابق دو کتابوں میں فیل طلبہ کا ضمنی امتحان ہوگا اور کامیابی کی صورت میں ترقی ملے گی جب کہ تین کتابوں میں ناکام طلبہ کا بہرصورت سال اعادہ ہوگا۔ ادنیٰ تر کامیابی کے لئے ہر کتاب میں کم از کم ۳۳ نمبر لانا ضروری ہے۔

تعطیل کلاں کا اعلان

سالانہ امتحان کی تاریخوں کے ساتھ ہی تعطیل کا اعلان بھی آویزاں کردیا گیا۔ دفتر تعلیمات کے مطابق سالانہ تعطیل ۱۶/شعبان تا ۱۰/شوال المکرّم رہے گی۔ ۱۱/ رویں شوال سے جامعہ کی تعلیمی سرگرمیاں شروع ہوجائیں گی۔

ختم بخاری شریف کا عظیم اجتماع

ہر سال کی طرح رواں شعبان (شب براءت) میں ختم بخاری شریف کا عظیم اجتماع منعقد ہوا، جس میں جانشین فخر المحدثین، حفید الانور، رئیس الجامعہ شیخ الحدیث حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری دامت برکاتہم نے بخاری شریف کی آخری حدیث کا درس دیا۔ آپ نے اپنی اس طویل اور پُر مواد تقریر میں **کلمتان حبیبتان الخ** پر مفصل، مدلل اور مکمل کلام فرمایا۔ آپ نے فرمایا کہ اس وقت احادیث کے لاتعداد ذخیرے دنیا میں موجود ہیں مگر امام بخاری کی یہ عظیم اور شاہکار کتاب جامعیت وانفرادیت میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی پوری ترتیب ان کے محدّثانہ، متکلمانہ، داعیانہ اور فقیہانہ مزاج کا آئینہ دار ہے۔ امام بخاریؒ کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے پوری سیرت اور اسلامی معاشرت کو بھرپور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ پہلی ہی حدیث: **انما الاعمال بالنیات الخ** لاکر اخلاصِ نیت کی اہمیت پر بھرپور روشنی ڈال دی کہ جس عمل میں اخلاص نہیں ہوتا اللہ کے ہاں کوڑی برابر بھی اس کا بھاؤ نہیں ہو، چھوٹے سے چھوٹا عمل اخلاص سے بڑا اور بڑے سے بڑا عمل ریاکاری سے کالعدم بلکہ وبالِ جان ہوکر رہ جاتا ہے۔ اس لئے امام بخاریؒ نے پہلی ہی حدیث سے اپنے مستفیدین کو اشارہ کردیا کہ ارشاداتِ پیغمبر ﷺ آپ میں اسلامی انقلاب اسی وقت پیدا کریں گے جب آپ اخلاص نیت کو اپنا حرزِ جاں بنائیں۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ جب مجلس لگتی ہے تو اس میں نادانستہ طور پر غیر اسلامی بحثیں بھی چل پڑتی ہیں جن سے حبطِ اعمال کا خطرہ رہتا ہے، اسی لئے اختتام مجلس پر دعا رکھی گئی جو کفارۂ مجلس کا کام کرتی ہے۔ احادیث کا پڑھنے والا گویا پیغمبر علیہ السلام کی مجلس میں ہے اور وہ براہِ راست آپ علیہ السلام سے ہی استفادہ کررہا ہے، اسی لئے ختم بخاری پر امام صاحب نے **کلمتان حبیبتان الخ** کو رکھا تاکہ مستفیدین مجلس کا کفارہ بھی پیش نظر رکھیں۔

حضرت شاہ صاحب مدظلہ نے مزید فرمایا کہ بخاری شریف حدیث کی ایک عام کتاب کی طرح نہیں

ہے، مگر یہ اس قدر عظیم ہے کہ اس کا اندازہ لگانے کے لئے ماضی اور حال کی ورق گردانی کرنی پڑے گی۔ صرف عربی میں ہی اس کی لاتعداد شرحیں لکھی جا چکیں، جن میں فتح الباری، عمدۃ القاری اور ارشاد الباری وغیرہ قابل رشک شرحیں ہیں۔ ماضی قریب میں خاتم الفقہاء والمحدثین امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ الکشمیریؒ کی فیض الباری بھی آئی، جس کی عظمتِ شان مسلم ہے، تاہم دعوے سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس نے بخاری شریف کا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ امام بخاری اور ان کی کتاب کے حصے میں یہ مقبولیت کسبی نہیں، وہبی ہے۔ انہوں نے اپنے اخلاص اور حسنِ نیت سے ان مقامات بلند تک رسائی حاصل کی۔ امام صاحبؒ کی ایک شان یہ بھی ہے کہ وہ بیانِ حدیث کے ذیل میں تراجم ابواب کے ذریعے اپنے زمانے کے فرقۂ ضالہ و باطلہ کا بہت ہی معقولیت کے ساتھ تعاقب کرتے ہیں۔ اس طرح وہ گویا اپنے قارئین کو یہ سبق دیتے ہیں کہ پیغمبر علیہ السلام کے ہر سپہ سالار اور فوجی کو داعیانہ صفات کے ساتھ متکلمانہ صلاحیت سے بھی مالا مال ہونا چاہئے۔ خیال رہے کہ وہ باطل فرقے وقت کے ساتھ ختم نہیں ہو گئے بلکہ مکھوٹے بدل بدل کر ان کا وجود آج بھی ہے اور پہلے سے بہت زیادہ سنگین صورتوں میں۔ لہٰذا آج ہمارے فضلائے مدارس پر ان کا علمی تعاقب بے حد ناگزیر ہے۔

اس موقع پر احقر فضیل احمد ناصری نے متعدد جوڑوں کا نکاح پڑھایا۔ درسِ بخاری سے قبل اساتذۂ جامعہ نے حالاتِ حاضرہ پر بیش قیمت تقریریں بھی کیں۔ حضرت رئیس الجامعہ مدظلہٗ کی پرسوز دعاء پر تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ اجلاس کی نظامت احقر نے کی۔

رواقِ انظر کی تعمیر جاری

جامعہ کی نئی زیرِ تعمیر عمارت ''رواقِ انظر'' اپنے روزِ تعمیر سے عروج پر ہے۔ یہ وسیع و عریض عمارت طلبۂ عزیز کی رہائش کے لئے ۴۶ رکمروں پر مشتمل ہوگی۔ کام لنٹر تک پہنچنے کے قریب ہے۔ تعمیر کی یہی تیزی جاری رہی تو انشاء اللہ جلد ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی۔ قارئین سے اس کی جلد تعمیر کے لئے خصوصی دعاؤں کی درخواست ہے۔

انعامی جلسہ

حسبِ روایت جامعہ امام محمد انور شاہ، دیوبند میں سالانہ انعامی اجلاس و دستار بندی بابت ۱۴۳۹ھ

رئیس الجامعہ حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ کشمیری دامت برکاتہم کی صدارت اور احقر فضیل احمد ناصری کی نظامت میں منعقد ہوا، جس میں طلبہ کے علاوہ علمائے کرام کی بڑی تعداد بھی شریک رہی۔ اس موقع پر تقریباً دو لاکھ روپے کے انعامات سے طلبہ کو نوازا گیا۔

امتیازی نمبرات والے طلبہ کو خصوصی انعامات بھی دیے گئے۔ ممتاز طلبہ کو حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی جانب سے تقریباً ۱۰/ ہزار روپے کے نقد انعامات بھی دیے گئے۔ عمومی اور تشجیعی انعامات ایک لاکھ تئیس ہزار روپے کی کتابوں کی صورت میں تقسیم کئے گئے۔ پوزیشن لانے والے طلبہ کو صدریاں بھی دی گئیں، جو کم وبیش پندرہ ہزار روپے کی تھیں۔ امسال تکمیلِ حفظ کرنے والے چار حفاظ اور پچھلے سال دورہ حدیث شریف سے فارغ ہونے والے طلبہ کی دستار بندی بھی کی گئی۔ اس موقع پر صدر جلسہ رئیس الجامعہ حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ کشمیری مدظلہ نے کہا کہ: یہ کتابیں، جو آپ کو انعام میں دی گئیں، دیوبند کے تاجرانِ کتب کی مرہونِ منت ہیں۔ یہ کتب ان تاجروں کے فراخ دلانہ تعاون اور جامعہ کے ساتھ دیرینہ تعلقات کا اظہار بھی ہیں اور کامیاب طلبہ کے لئے ان کی طرف سے تشجیع اور مہمیز بھی۔ ہم خدامِ جامعہ ان سبھی تاجران کتب بالخصوص فرزندان حضرت مفتی سعید صاحب پالن پوری، بھائی تاج عثمانی، خواجہ انس مالک مکتبہ نعیمیہ، مکتبہ صفدریہ دیوبند، مکتبہ الحرمین، مکتبہ الفلاح ممبئی اور مولانا انعام الٰہی صاحب مالک مکتبہ ملت کے بے حد مشکور ہیں۔ طلبہ کو حالات حاضرہ سے روشناس کراتے ہوئے صدر جلسہ نے کہا: یہ دور ہر شخص کے لیے محتاط رہنے کا ہے۔ انسان کی ذرا سی غفلت اور معمولی سی چوک بڑے بھاری خسارے کا سبب بن سکتی ہے۔ آپ سوشل میڈیا سے حتی الامکان دور رہیں۔ آپ کوئی ایسا کام ہرگز نہ کریں جن سے آپ پر کوئی حرف آ سکے۔ آپ سیر وتفریح میں چوکنے رہیں اور ایسے مقامات پر قطعاً نہ جائیں جہاں آپ کے لیے اپنا تحفظ دشوار ہو جائے۔ صدر جلسہ نے انعام کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ انعامات آپ کے لئے بڑے قیمتی ہیں۔ ان طلبہ کے لئے حوصلہ افزا تو ہیں ہی، جنہوں نے ممتاز نمبرات حاصل کیے، لیکن اس کے ساتھ ہی ان طلبہ کے لئے بھی یہ انعامات امید بخش ہیں جنہوں نے اچھے نمبر حاصل نہیں کیے اور جیسی توقعات ان سے وابستہ تھیں، ان پر کھرے نہ اتر سکے۔ امید ہے کہ کامیاب طلبہ کو دیکھ کر وہ بھی انہی جیسی کوشش کریں گے اور آگے بڑھیں گے۔ جامعہ کے استاد حدیث و نائب ناظم تعلیمات مولانا فضیل احمد ناصری صاحب نے کہا کہ یہ دور بڑا عجیب وغریب اور تضادات سے بھرپور ہے۔ ایک طرف دیکھیے تو حصول علم کے ذرائع بے پناہ پھیل گئے اور دوسری طرف علم کا شوق بھی ماضی سا نہیں رہا۔ معلومات ایک پل میں ادھر سے ادھر اور دنیا کے

ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ جاتی ہیں۔ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی بھی۔ یہ جدید دور کی بلاشبہ بڑی کامیابی ہے، لیکن معلومات اور شے ہے، اور علم دوسری شے۔ معلومات کے ذرائع بلاشبہ بڑھ گئے، لیکن علمی انحطاط بھی ان کے ساتھ ہی تشویش ناک حد تک بڑھ گیا۔ اب طلبہ کتابوں سے زیادہ انٹرنیٹ سے لگے رہتے ہیں اور اسی سے ہیں استفادے کی کوششیں کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ صورت حال طلبہ کے لئے سمِ قاتل اور سنگین ہے۔ طلبہ کو سوشل میڈیا سے جس قدر ممکن ہو دور ہی رہنا چاہیے اور انتظامیہ کو بھی اس سلسلے میں ٹھوس اقدامات کرنے چاہییں تاکہ طلبہ کا مستقبل گرہن زدہ نہ ہو۔ احقر فضیل احمد ناصری نے جامعہ کی سالانہ تعلیمی رپورٹ بھی پیش کی۔

دارالعلوم وقف دیوبند کے استاد اور مرکز نوائے قلم دیوبند کے رئیس حضرت مولانا نسیم اختر شاہ قیصر مدظلہ نے بھی اس موقع پر طلبہ سے خطاب کیا، انہوں نے کہا کہ بھلا آدمی وہ ہے جو اپنی غلطی کو تسلیم کرے اور اپنے نقصانات کو محسوس کرے۔ یہ چیز آج کے طلبہ میں نہیں پائی جاتی اور یہی زوال علم کی جانب پہلا قدم ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ اپنی قیمت کو سمجھیں۔ آپ کا انتخاب اللہ کی طرف سے ہوا ہے۔ آپ کو اپنے مقصد میں مگن رہنا چاہیے۔ لاحاصل مصروفیات میں خود کو کھپانا اپنے ہاتھوں اپنی زندگی برباد کرنا ہے۔ انہوں نے مزید کہا: ایک عجیب بات ہے کہ آج کل قلت وقت کی شکایت ہر شخص کو ہے، لیکن وقت کو کارآمد بنانے والے لوگ بس برائے نام ہی ہیں۔ آپ ان لوگوں میں نہ بنیں جو قلتِ وقت کی بلاوجہ شکایت کرتے ہیں، بلکہ ان لوگوں میں بنیں جو وقت کو کارآمد اور اپنے حق میں مفید بناتے ہیں۔ دارالعلوم وقف کے مبلغ اور دیوبند اسلامک یونیورسٹی کے بانی وچانسلر مولانا زین الدین قاسمی نے بھی اجلاس سے خطاب کیا، انہوں نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ اسلام کی ترجمانی کیسے کرنی ہے، کیوں کہ درس گاہیں از صبح تا شام چوبیس گھنٹے اسی کی تعلیم دیتی ہیں۔ آپ کو ہر محاذ پر کھڑا ہو کر اور تقوی وطہارت کے ساتھ ملت کی پاسبانی کا فریضہ انجام دینا ہے۔ مولانا یہ بھی کہا کہ آدمی کی قدر و قیمت اسی وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے کہے ہوئے افکار و خیالات پر خود بھی عامل ہو۔ عزیز طلبہ! ملت پیاسی ہے اور معاشرہ آپ کے انتظار میں ہے۔ وقت بھی نازک ہے۔ ایسے وقت میں آپ کی ذمے داری دوچند ہو جاتی ہے۔

جامعہ کا استاد حدیث مولانا مفتی وصی احمد قاسمی بستوی نے کہا کہ خشیت الٰہی کا بنیادی ذریعہ علم ہے اور اس علم کو بندوں تک پہنچانے کا نام نبوت و رسالت ہے۔ علماء کو انبیاء کا وارث اسی لئے بنایا گیا ہے، کیوں کہ وہ نبوت کا مشن لے کر چلتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ مدارس اسلامیہ دین کو صحیح شکل میں سنبھالے ہوئے

ہیں۔ یہ مکمل اسلام کے ترجمان ہیں۔ انہوں نے مزید کہا اسلام میں عقیدے اور نظریے کی بڑی اہمیت ہے۔ عقائد کی درستگی ہی مدار نجات ہے۔ مولانا مفتی نثار خالد قاسمی استاذ حدیث جامعہ کی دعا پر اجلاس کا اختتام ہوا۔ اس موقع پر محترم جناب مولانا صغیر احمد پرتاب گڑھی، مولانا مفتی نوید احمد دیوبندی، محترم جناب مولانا ابوطلحہ اعظمی صاحب، محترم جناب مولانا عبید انور شاہ صاحب، جناب خالد گل صاحب اور صحافی جناب رضوان سلمانی صاحب بھی موجود رہے۔

نونابڑی کے اجلاس میں اساتذۂ جامعہ کی شرکت

دارالعلوم انوریہ دیوبند سے ملحقہ ایک گاؤں ''نونابڑی'' میں قائم ہے جس کی داغ بیل فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیریؒ بانی جامعہ نے ڈالی تھی اور وہی تاحیات اس کے سرپرست رہے۔ اب اس کی سرپرستی رئیس الجامعہ حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری دام ظلہٗ فرمارہے ہیں۔

۲۶/مارچ بروز منگل یہاں کے سالانہ اجلاس میں احقر فضیل احمد ناصری اور استاذ حدیث محترم جناب مولانا صغیر احمد پرتاپ گڑھی زیدمجدہم نے شرکت کی۔

احقر نے اپنی تقریر میں کہا کہ اتباعِ سنت ہماری کامیابی کی شاہ کلید ہے، ہم اسی راستے سے دنیا و آخرت میں سرخرو ہوسکتے ہیں۔ اتباعِ سنت کی ایک کڑی اسلامی یونیفارم بھی ہے۔ جس طرح فوج کا ایک مخصوص یونیفارم ہوتا ہے، پولیس کا یونیفارم ہوتا ہے، عدالتوں اور اسکولوں کا یونیفارم ہوتا ہے، اسی طرح ہمارے لئے بھی ایک مخصوص یونیفارم ہے۔ ہمارا یونیفارم شرعی داڑھی، مسنون ٹوپی اور مسنون لباس ہے، جسے وارثینِ انبیاء ابتدائی عہد سے استعمال کرتے آئے ہیں۔ اس یونیفارم کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بہت سے گناہوں کے لئے مضبوط ڈھال ہے۔ اس یونیفارم کے ساتھ کھلے اور بڑے گناہ بالعموم صادر نہیں ہوتے۔ ساری مسلمان اس لباس کو استعمال کریں اور اس کی برکات اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

استاذ حدیث مولانا صغیر احمد پرتاپ گڑھی نے کہا کہ مسلمانوں کی کمزوریوں کے بڑے اسباب میں ایک بڑا سبب باہمی اتحاد کا فقدان ہے۔ بھائی بھائی سے کٹا ہوا ہے، دوست دوست سے نالاں ہے، رشتے ناطے کی اہمیت دکھائی نہیں دیتی۔ مسلمان اپنی اس کمی کو جتنی جلدی دور کرلیں، اسی قدر اچھا ہوگا اور وہ اسی تیزی سے توانا ہوں گے۔ اتحاد و اتفاق وہ نعمت ہے جس کے حصول کے لئے قرآن و حدیث نے بڑی تاکید کی ہے اور مفید ترین ترکیبیں بھی بتائی ہیں۔ مولانا پرتاپ گڑھی کی دعاء پر اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ سیمینار میں احقر کی شرکت

۳۱ر مارچ کو نظام الدین دہلی کے ''غالب اکیڈمی'' میں کل ہند سیمینار ہوا، جو ممتاز اہل قلم و صحافی، شہرۂ آفاق ادیب و مصنف حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کی حیات و خدمات پر منعقد ہوا تھا، اس مجلس میں احقر فضیل احمد ناصری نے بھی شرکت کی اور مقالہ پیش کیا۔ خاکسار کے مقالے کا عنوان تھا'' مولانا اکبر آبادیؒ اور علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ سے ان کا تلمذ و تعلق'' خاکسار کا یہ مقالہ اسی شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا اکبر آبادیؒ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور علامہ کشمیریؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ علامہ سے ان کا بڑا مضبوط اور اٹوٹ تعلق تھا۔ ڈابھیل میں بھی مدرس رہے اور علامہ کشمیریؒ سے بے حد قریب۔ مولانا اکبر آبادیؒ علامہ کشمیریؒ کے ساتھ گزرے ایام کو اپنی حیات کا بیش قیمت اثاثہ سمجھتے۔ ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸۵ء میں وفات پائی۔

جامعہ میں دعائے قنوتِ نازلہ کا اہتمام

ہمارا ملکی مزاج جس تیزی سے تبدیل ہوا ہے اس نے سنجیدہ اور باشعور افراد کے رونگٹے کھڑے کر دیئے ہیں۔ ادھر ۱۰ر اپریل سے لوک سبھا کے انتخابات بھی ہیں، جن کے نتائج آئندہ پانچ برسوں پر اثر انداز ہوں گے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی واپسی، بقائے باہمی کی بازیابی اور ملکی سالمیت کا استحکام وہ چیزیں ہیں جن کے لئے تدبیر کے ساتھ دعاؤں کے سہارے کی بھی ضرورت ہے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر جامعہ میں نماز فجر میں قنوتِ نازلہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اللہ کرے کہ ملکی فضا پھر بہار آشنا ہو اور خزاں کا یہ دور جلد از جلد ختم ہو۔

حضرت مولانا جمیل احمد سکروڈھویؒ کے لئے دعائے مغفرت

صد افسوس کہ دارالعلوم وقف کے سابق استاذِ حدیث اور دارالعلوم دیوبند کے ممتاز استاذ شارح الفقہ حضرت مولانا جمیل احمد سکروڈھوی صاحب دہلی کے ایک ہسپتال میں انتقال فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے، انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل۔ مولانا تقریباً سوا برس سے سرطان کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ ان کی کیموتھیراپی چل رہی تھی۔ کبھی

مائل بہ صحت، کبھی زوال آمادہ۔ ادھر کچھ دنوں سے بیماری نے شدت اختیار کرلی تھی اور یہی شدت بالآخر ان کے لیے پروانہ موت ثابت ہوئی۔ مولانا مرحوم تدریس کے حوالے سے انتہائی معتبر شخصیت کے مالک تھے۔ تدریس کا آغاز بھی دارالعلوم سے کیا تھا اور سفر بھی اسی پر تمام ہوا۔ مولانا دارالعلوم وقف کے روزِ اول سے ہی کھڑے رہے۔ حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کے عہدِ اہتمام میں پیش آمدہ قضیہ نامرضیہ کے بعد جو شخصیات دارالعلوم سے علیحدہ ہوئیں ان میں مولانا سکروڈھوی بھی تھے اور قاری محمد طیب صاحبؒ کے زبردست حامیوں میں ان کا شمار تھا۔ دارالعلوم وقف میں کم وبیش اٹھارہ سال انہوں نے مسندِ تدریس سنبھالی۔ یہاں بخاری بھی ان سے متعلق رہی۔ ترمذی شریف کے وہ مشہور استاذ تھے۔ بیضاوی شریف بھی بڑی مہارت سے پڑھائیں۔ ان کی شہرت کی ایک وجہ تو تدریس ہی رہی اور دوسری وجہ ان کی شروحات۔ تدریس میں انہیں وہ ملکہ اور درک حاصل تھا کہ طلبہ ان کی درس گاہ سے قبل از وقت اٹھنا، یا گھنٹہ ناغہ کرنا متاعِ گراں مایہ کا سلب تصور کرتے۔ ان کا پڑھایا ہوا سبق درس گاہ میں ہی یاد ہو جاتا تھا۔ فقہ سے ان کی مناسبت مثالی تھی اور اسی مناسبت نے انہیں کامیاب مدرس بنا دیا تھا، ان کی شہرت کی دوسری وجہ ان کی شروحات ہیں۔ ہدایہ کی شرح کئی جلدوں میں لکھی۔ تقریباً تین چوتھائی کی شرح تو اشرف الہدایہ کے نام سے لکھی، جب کہ بقیہ حصے کی شرح تفہیم الہدایہ کے نام سے۔ اس کے علاوہ مختصر المعانی کی شرح تکمیل الامانی، نور الانوار کی شرح قوت الاخیار، اصول الشاشی کی شرح اجمل الحواشی اور حسامی کی شرح فیضِ سبحانی کے نام سے لکھی۔ یہ شروحات خوب مقبول ہوئیں اور افسانوی شہرت ان کے حصے میں آئی۔ مرحوم بحیثیت عالم بھی بہترین شخصیت رکھتے تھے اور اسلاف کی اداؤں سے مالا مال تھے۔ صد حیف کہ سکروڈہ سہارنپور کا یہ جیالا بھی موت کی نیند سو گیا۔ آج ان کی جدائی پر دل مغموم ہے اور قلم ساکت وحیران۔ قدرت کے خزانے میں کوئی کمی نہیں، لیکن بظاہر اب کوئی اور جمیل پیدا نہ ہوگا۔ والغیب عنداللہ۔

نمازِ جنازہ اگلے دن یعنی پہلی اپریل کو صبح ۹ بجے ہوئی اور قاسمی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ جامعہ میں ان کے لیے ایصالِ ثواب کیا گیا اور ان کی موت کو ملت کا ایک بڑا خسارہ باور کیا گیا۔

❀❀❀

نقد و نظر

مبصر: فضیل احمد ناصری

نام کتاب: مشاہیر اکابر ومعاصرین مصنف: حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ
مرتب: مولانا احمد سجاد قاسمی صفحات: ۴۵۵ ناشر: مرکزی پبلیکیشنز، دہلی

مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ دارالعلوم دیوبند کے نامور مفتی رہے اور فقہ وفتاویٰ میں بڑا نام پیدا کیا۔ ان کے فتاوے اہلِ علم میں کافی پسند کیے جاتے تھے۔ دارالعلوم کی وسیع وعریض لائبریری کی فن وار ترتیب اور مناسب ترین وضع انہیں کی تخلیق ہے، ورنہ تو ایک وقت وہ بھی تھا کہ لائبریری سے مطلوبہ کتابوں کا نکالنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ فتاویٰ دارالعلوم بھی انہیں کی ترتیب وتہذیب اور تخریج وتحشیہ سے ابتداءً منظرِ عام پر آئی اور خوب مقبول ہوئی۔ ابتدائی ۱۱؍ جلدیں انہیں کی مساعی کی عکسِ جمیل ہیں۔

حضرت مفتی صاحب بڑے فقیہ ہونے کے ساتھ بڑے مصنف بھی تھے اور مسلم ادیب بھی۔ درجنوں کتابیں ان کے خامۂ عنبر شامہ سے نکلیں اور مقبولِ عام ہوئیں۔ ان کا قلم کوثر وتسنیم کا عکاس اور جوئے سلسبیل کا پرتو تھا۔ وہ الفاظ کے انتخاب اور خوبصورت جملہ سازیوں پر یدِ طولیٰ رکھتے تھے، ان کی تحریروں میں اگرچہ سادگی تھی، مگر شہد کی مٹھاس، بلا کی چاشنی اور دریاؤں کی روانی سے بھرپور تھی۔ آپ ان کے مضامین پڑھیے تو اپنے معمولات کی ساری ترتیب بھول جائیں گے۔ مساجد کی تاریخ پر ان کی جلد وار کتاب اہلِ علم کے لئے سرمۂ بصیرت ہے۔ جس موضوع پر بھی خامہ فرسائی کرتے، اسے باغ و بہار بنا دیتے، ان کے قلم میں وہ تاثیر تھی کہ زہر بھی تریاق بن جاتا۔ ملک و بیرونِ ملک کے اخبار ورسائل میں ان کی تحریریں بڑے چاؤ سے چھاپی جاتیں اور ذوق وشوق سے پڑھی جاتیں۔ ماہنامہ دارالعلوم میں بھی ایک طویل عرصے تک لکھا اور جم کر لکھا، حتی کہ ۱۷؍ برس اس کے اداریے بھی لکھے، یہ ان کے قلم کا سحر ہی تھا کہ کئی قیمتی مسودے چوری کی نذر ہوگئے۔ اللہ جانے بعد میں وہ کس بندے کے نام سے چھپے۔

حضرت مفتی صاحب کی یوں تو ساری ہی نگارشات آبِ آتش لباس کا رنگ رکھتی تھیں، مگر شخصیات پر ان کی قلمی تراشوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ پیکر نگاریوں میں وہ اتنے باکمال کہ چھوٹے چھوٹے اور سہل ترین جملوں کے ذریعے زیرِ قلم شخصیت کی ہو بہو تصویر کھینچ دیتے۔ آپ ''حیاتِ مولانا گیلانی'' دیکھ لیجیے۔ اگر آپ نے پورا پڑھے بغیر اسے رکھ دیا تو آپ پر اسی وقت بیگانۂ ادب ہونے کا حکم لگ جائے گا۔ مفتی صاحب نے شخصیات پر خوب لکھا اور کثرت سے لکھا۔ مشاہیر اکابر پر بھی اور معاصر اہلِ علم پر بھی۔ وہ مضامین اپنے دور میں بہت پڑھی گئیں اور ان پر خوب تحسین و آفریں ملی۔

وقت گزرتا گیا اور مضامین کی تعداد بڑھتی گئی، ۲۰۱۱ء میں مفتی صاحب اپنے وطن دربھنگہ میں سفرِ آخرت پر چلے گئے۔ یہ مضامین متعدد رسائل میں بکھرے پڑے تھے، یہ ایک بڑا ذخیرہ تھا، جس کی جمع و ترتیب کی شدید ضرورت تھی، مگر یہ کام وہی کام کر سکتا تھا جس کی طبیعت مشکل پسند واقع ہوئی ہو اور ان تھک جدوجہد سے ابا نہ کرتی ہو، چناں چہ انہیں کے صاحب زادے جناب مولانا احمد سجاد قاسمی صاحب نے بیڑا اٹھایا اور ۳۱/کتب و رسائل سے ۷۰/ شخصیات پر تحریریں جمع کر دیں اور انہیں نہایت سلیقے سے مرتب کر دیا۔ ان میں سے ۲۱/مضامین تو وہ ہیں جو ۱۹/شخصیات پر مستقلاً لکھے گئے ہیں، جب کہ ۵۱/شخصیتوں پر وہ نگارشات ہیں جو ماہنامہ دارالعلوم کے ادارتی کالم میں لکھے گئے تھے۔ یہ سارے مضامین ان ادب و انشا کے تمام محاسن سے آراستہ ہے جن سے ادبی کائنات حسین و جمیل ٹھہرتی ہے۔

کتاب پر مفکرِ اسلام حضرت مولانا ولی رحمانی صاحب کا نہایت وقیع اور شستہ مقدمہ ہے، مقدمہ بجائے خود خاصے کی چیز ہے، جی چاہتا پڑھتے رہیں۔

کتاب درمیانی اور متداول سائز پر ہے، دہلی سے چھپی ہے، وہی دہلی جو طباعت کی دنیا میں اب قابلِ رشک بن چکی ہے۔ کتاب بڑی دل چسپ اور معلومات کا خزانہ ہے۔ اس کا مطالعہ ان اصحابِ علم و ادب کے لیے بہت ضروری ہے جو خاکہ نگاری سے شغف رکھتے ہوں۔ میں نے اسے پڑھا اور خوب محظوظ ہوا۔ ایسی کتاب کی موجودگی بلاشبہ لائبریری کے وقار کا ذریعہ بنے گی۔

❀❀❀

زبانِ خلق

مکرمی سلام مسنون!

ماہنامہ ''محدّثِ عصر'' کے جنوری/فروری ۲۰۱۹ء کے دوشمارے یکجا ملے، جب سے یہ ماہنامہ منصّۂ شہود پر جلوہ گر ہوا، تقریباً سارے شمارے نظر نواز رہے۔ یوں تو اس ماہنامے نے روزِ اوّل سے صاحبِ فکر و نظر اور باذوق حضرات سے خراجِ تحسین حاصل کیا ہے، اس کے قارئین نے اس گلشنِ بے خار سے حسبِ ذوق اپنے دامن پھولوں سے بھرے ہیں۔ اس وقت میرے سامنے مذکورہ شمارہ ہے جس کے تمام ہی مندرجات بیش قیمت ہیں۔

''ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہوئی'' معلوماتی مضمون ہے، ''تفقہ فی الحدیث اور علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ'' یہ مضمون ابھی جاری ہے، مضمون حضرت شاہ صاحبؒ سے متعلق ہے اور قلم ہمارے آپ کے محبوب، مولانا عبدالرشید صاحب بستویؒ کا، ظاہر ہے اس کے دامن میں کیا کچھ لآلی آب دار ہوں گے، بستوی صاحبؒ کا نام سامنے آیا، اک ہوک دل سے اٹھی۔ ''تاریخ بابل'' بھی خوب ہے اور ''مصنفینِ زنداں'' از مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحب تو کیا کہنے، اس طرح کے مضامین کی ضرورت ہمیشہ رہا کی ہے۔ عنوان اہم اور قلمِ زرنگار شاہ جی کا، خوب، بہت خوب! مگر یہ سلسلۂ مضامین آگے بھی چلے گا، نہیں معلوم ہو سکا، نہ قسط کا ذکر ہے اور نہ ''جاری'' کا اور آگے چلے تو ہم جیسے کم سوادوں کی معلومات میں اضافہ ہو، خدا کرے۔ اسی طرح پروفیسر محسن عثمانی صاحب کا مضمون ''یہ چراغ کوئی چراغ ہے......'' یہ مضمون فکر انگیز ہے اور آخر میں مولانا حسیب صدیقی صاحبؒ پر برادرم عمر الٰہی صاحب کا مضمون، حسبِ ضرورت ہے، عمدہ ہے، اچھا لکھا۔

اس ماہنامہ سے جو علمی و فکری رَو چلی ہے خدا کرے قلب و دماغ کے لئے متاعِ نور و سرور مہیا کرتی رہے۔

والسلام

ابوالحسن اعظمی، دیوبند

رکن رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ

۲۴/مارچ ۲۰۱۹ء

❀❀❀

تازہ بہ تازہ (۲)

تمام لوگ ہماری ہی اقتدا کرتے

فضیل احمد ناصری

سحر کی ہم جو صحابہؓ سی ابتدا کرتے
تمام لوگ ہماری ہی اقتدا کرتے

خدا سے اپنا تعلق اگر جواں ہوتا
نمازِ صبح نہ ہرگز کبھی قضا کرتے

ہمیں تو صاحبو! عشقِ گناہ نے مارا
مَرَض کا خوف جو ہوتا تو پھر دوا کرتے

جو دور دور سے دیتے ہیں گالیاں ہم کو
ہمارے پاس جو ہوتے تو جاں فدا کرتے

گلے ملے کہ دکھائی نہ دی سبیلِ نجات
تمہیں بتاؤ کہ ہم ان سے کیا ِگلا کرتے

اندھیری رات تھی، راہیں بھی سازگار نہ تھیں
نہ ہم چراغ جلاتے تو اور کیا کرتے

ہماری قوم ہی مائل بہ کفر ہے، ورنہ
ہری ہری کے فدائی خدا خدا کرتے

ہماری بات زمانہ بھی غور سے سنتا
خدا کی بات جو ہم بھی سدا سنا کرتے

ہمارا دستِ طلب وہ کبھی نہ لوٹاتا
رسولِ پاکؐ سے عنبرؔ جو ہم وفا کرتے

❀❀❀

اہل خیر حضرات کی خدمت میں

رمضان المبارک ۱۴۴۰ھ مطابق مئی/جون ۲۰۱۹ء میں جامعہ کے لیے مالی تعاون حاصل کرنے کی غرض سے جن اساتذہ ومحصلین کو جس شہر یا علاقہ میں بھیجا جارہا ہے، اُس کی تفصیل ذیل میں دی جارہی ہے: اہل خیر حضرات سے تعاون کی درخواست ہے۔

نوٹ : رمضان المبارک ۱۴۳۴ھ مطابق جولائی/اگست ۲۰۱۳ء سے نئے ڈیزائن ونمبرنگ کے ساتھ رنگین رسیدات کا اجراء کیا گیا ہے، اس لیے تمام سابقہ رسیدات منسوخ سمجھی جائیں۔

۱	محترم جناب مولانا شیث احمد صاحب/استاذ حدیث 09897406800 مہاراشٹر
۲	محترم جناب مولانا مفتی نثار خالد صاحب/استاذ حدیث 07895070594-07037668071 کلکتہ
۳	محترم جناب مولانا فضیل احمد صاحب ناصری/استاذ حدیث 08881347125 ممبئی
۴	محترم جناب مولانا محمد ابوطلحہ صاحب/استاذ تفسیر وفقہ 09997504588 جموں وکشمیر/مہاراشٹر/بنگلور/مدراس/بڑودہ
۵	جناب مولوی عبداللہ رشید صاحب/استاذ 08630905278, 09634506041 ممبئی
۶	جناب ذکی انجم صدیقی صاحب/ہیڈ کلرک 09058839273 دیوبند
۷	جناب مولوی محمد امین صاحب/محصل شعبہ 08979399192-09018249398 جموں وکشمیر/پنجاب/راجستھان
۸	جناب مولوی عشرت اللہ صاحب/محصل شعبہ 07275869794 مشرقی اترپردیش
۹	جناب مولوی محمد حنیف/محصل شعبہ 098088088003 بھروچ/سورت/نوساری/رواپی/آنند/مرادآباد/بریلی/میرٹھ/باغپت/مظفرنگر/بجنور
۱۰	جناب مولوی محمد لقمان صاحب/محصل شعبہ 08650959864-07840042786 دہلی/پونہ/اتراکھنڈ/احمدآباد/گودھرا/آندھراپردیش/تلنگانہ/کرناٹک/تامل ناڈو

. جامعہ امام محمد انورشاہ کا تفصیلی تعارف/دستورنامہ/نصاب تعلیم اور ماہنامہ محدّثِ عصر وغیرہ Jamia Imam Muhammad Anwar Shah کے فیس بک پیج پر دستیاب ہے۔

جامعہ میں زیر تعمیر جدید دارالاقامہ کا مجوزہ نقشہ

انور ہال

مسجد انور شاہ

دارالاقامہ کا بیرونی منظر

دارالاقامہ کا اندرونی منظر

Jamia Imam Mohammad Anwar Shah
A/c No. 520101265117956
Corporation Bank Deoband, IFSC Code: CORP0000786